"نگار" کا ہندی شاعری نمبر (دوسرا ایڈیشن مع اضافہ) قیمت :- چار روپیہ (علاوہ محصول)

نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

اکتالیسواں سال | فہرست مضامین مارچ ۶۲ء | شمارہ ۳

ملاحظات	اڈیٹر	۲
میرزا مظہر کے فارسی خطوط	خلیق انجم	۶
شاہ عالم کا ہندوستان	خان رشید	۱۲
افسانہ از افسانہ	ع - ر	۲۷
باب الاستفسار :-	اڈیٹر	
(۱) رسول اللہ کے معجزے		
(۲) تیسری عالمی جنگ اور جمہوریت و اشتراکیت کا مستقبل		
(۳) پس منظر یا پیش منظر		
(۴) محمود و ایاز کی محبت کا راز		۳۶
(۵) فردوسی کا ایک شعر		
باب الانتقاد (مستحصلات الجفر)	اڈیٹر	۴۶
نگارہات	اڈیٹر	۴۹
منظومات :-	امجد نجمی - اکرم دھولیوی، درد سعیدی - جمیل مظہری، متین نیازی - شفقت کاظمی	۵۱
مطبوعات موصولہ	اڈیٹر	۵۴

ملاحظات

دستور پاکستان اور حکومت اسلامی کا بنیادی تصور

میرا مقصود اس وقت دستور پاکستان پر تبصرہ کرنا نہیں، کیونکہ نہ وہ ابھی تک سامنے آیا ہے اور نہ میں اس پر کسی رائے زنی کا مجاز ہوں۔ بلکہ صرف یہ خبر سن کر کہ پاکستان کا دستور مرتب ہوگیا ہے اور جلد شایع ہونے والا ہے، بے اختیار اب سے تقریباً چودہ سو سال قبل کا وہ زمانہ یاد آگیا جب سب سے پہلے سیاست اسلامی کا بنیادی تصور پیش کیا گیا اور اتنا عظیم الشان تصور کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مفکر، بڑے سے بڑا ریفارمر اور بڑے سے بڑا مقنن اس سے بہتر تصور پیش نہیں کر سکا۔ ایک ایسا مستحکم تصور ایسا مکمل تصور کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس میں کسی تغیر و تبدل کسی ترمیم و اصلاح کی گنجایش نہیں، پھر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی بسیط دفتر پیش کیا گیا تھا، اس آئین و دستور کی وضاحت کے لئے کوئی کتاب مرتب کی گئی تھی، بالکل نہیں بلکہ یہ سارا کانسٹی ٹیوشن صرف ایک فقرہ میں بند تھا :- "الملک للہ والملک للہ" (یعنی زمین بھی اللہ کی اور حکومت بھی اللہ کی)۔ پھر دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اول اول جب کوئی تنہا فرد اپنی قوی و مضبوط شخصیت سے ملک پر متصرف ہوگیا تو اس کا آئین حکومت مستبدانہ، ملوکانہ یا آمرانہ کہلایا گیا، لیکن وہ زیادہ نہ چل سکا، کیونکہ دوسرے اکابر و امراء کی جماعت نے اس جابرانہ تسلط کو عرصہ تک گوارا نہ کیا اور رفتہ رفتہ اس اصول حکومت کو توڑ کر خود اپنی حکومت قائم کی جسے ارسٹاکریسی کہتے ہیں، لیکن حکومت یہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوئی اور عوام نے اس کے خلاف مظاہرہ و احتجاج

...ور کثیر قربانیوں کے بعد اپنی حکومت قایم کی جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کہتے ہیں جو اس وقت انتہائی ترقی یافتہ تصور حکومت خیال کیا جاتا ہے) لیکن روس اور چین نے اسے بھی قبول نہ کیا اور اشتراکیت کو رواج دیا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بڑی حد تک جمہوریت کو متنزلزل کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی حکومت کا کوئی ایسا بلند تصور نہیں، جو نوع انسانی کو مطمئن کر کے دنیا میں کامل امن و سکون پیدا کر سکے۔

آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اصل بنیاد حکومتوں کی اس ناپایداری اور باہمی اختلاف و نزاع کی صرف جذبۂ ملکیت پر قایم ہے ...ہ انفرادی اختلاف ہو یا جماعتی، قومی اختلاف ہو یا ملکی، سب جذبۂ ملکیت پر قایم ہیں، اور اس جذبہ کو کوئی آئین حکومت دور نہیں کر سکا۔

اشتراکیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے انفرادی ملکیت کے بجائے قومی ملکیت قایم کر کے نزاع ملکیت کو ختم کر دیا ہے، لیکن یہ ...بھی صرف ذہنی مغالطہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اب اور زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، کیونکہ وہ جذبہ جو پہلے چند ...فراد یا چند مخصوص جماعتوں میں پایا جاتا تھا اب اس نے قومی جذبہ کی صورت اختیار کر لی ہے، یعنی اگر پہلے یہ باہمی نزاع ہزاروں ...ک محدود تھی تو اب کروروں تک پہونچ گئی ہے اور چھوٹے چھوٹے بتوں کی جگہ ایک بہت بڑے بت یا مہیب دیوتے نے لی ہے پھر ...گر یہ بت ساری دنیا میں ایک ہی ہوتا اور تمام نوع انسانی اسی کی پرستش پر مجبور کر دی جاتی تو بھی غنیمت تھا، لیکن دشواری یہ ...ہے کہ اس بت کے مقابلہ میں ایک دوسرا بڑا بت جمہوریت کا بھی ہے اور انھیں دونوں کی کشاکش نے اس وقت تمام نوع انسانی کو ...پریشان و مضطرب کر رکھا ہے اور دنیا سے حقیقی سکون کو مفقود!

اب اس کے مقابلہ میں آپ اسلام کے تصور حکومت و سیاست پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں سرے سے کسی اختلاف و نزاع یا کشمکش مسابقت کی گنجایش ہی نہیں، کیونکہ اس میں نہ ملکیت کسی انسان کی ہے اور نہ حکومت کسی خاص فرد یا جماعت کی۔ ...دونوں کا مالک خدا ہے اور اس کی وراثت اگر منتقل ہو سکتی ہے تو صرف اس طرح کہ:-

"ان الارض یرثھا عبادی الصالحون"

...یہ ہے وہ صحیح بنیادی تصور حکومت جس سے ہٹ کر اگر کوئی دستور و آئین بنایا گیا تو کبھی دیرپا ثابت نہ ہوگا اور کوئی قوم اس پر اعتماد ...کر کے عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی، یہاں تک کہ جب خود مسلم حکومتوں نے اس بنیادی اصول کو ترک کر دیا تو وہ بھی ختم ہو گئیں۔ ...خدائی قانون ساری دنیا کے لئے ایک ہے اور مسلم و غیر مسلم دونوں سے بے نیاز!

اب آئیے اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سن لیجئے:

اسلام نے یہ کہکر کہ زمین و حکومت دونوں خدا کی ہیں، ملوکیت یا آمرانہ حکومت کو تو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، لیکن دنیا کو ...اس اصول پر چلانے اور افراد نوع انسانی کو ایک ہی رشتۂ اتحاد سے وابستہ رکھنے کے لئے اس نے خلافت الٰہی و نیابت الٰہی کا منصب ...ضرور قایم رکھا، جس کی حیثیت امارت کی نہیں بلکہ محض قیادت کی تھی، حاکم کی نہیں بلکہ خادم کی سی تھی، اور اس خدمت کا تنظیمی ...معیار یہ تھا کہ "امرہم شوریٰ بینہم" اور اخلاقی یہ کہ:-

"ان تؤدوا الامانات الیٰ اہلہا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل"

امانات بڑا وسیع لفظ ہے جس میں انسانی حقوق و جذبات بھی شامل ہیں اور خلافتی فرایض و واجبات بھی۔ انسانی حقوق کی ...حفاظت تو خیر لازم ہونا ہی تھی، لیکن اس میں حاکمانہ حقوق کو بھی شامل کر کے یہ تاکید کر دی گئی کہ وہ بھی کسی ایسے ہی شخص کے سپرد ہونا ...چاہئے جو محض نوع انسانی کی خدمت کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو اور عدل و انصاف سے سرمو انحراف نہ کرے۔

یہ تھی وہ تعلیم جس نے سب سے پہلے ملک و حکومت سے ذاتی ملکیت کے تصور کو ختم کیا اور اس کے بعد حکومت کے لئے اہلیت کو ...شرط اولین قرار دے کر اس کا فیصلہ اس نے مشورہ یا رائے عامہ پر چھوڑ دیا۔ گویا اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے ملکیت و ...ملکیت کے تصور کو ختم کر کے حکومت کی بنیاد خالص اخلاق پر قایم کی اور اسی کے ساتھ انتخابی حکومت کا وہ اصول مقرر کیا

(جس پر آج کل تمام جمہوری حکومتوں کا عملدرآمد ہے) لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جس کا انتخاب کیا جائے وہ حاکم و فرمانروا نہ ہو بلکہ محافظ و خادم ہو، اور نیابتِ خداوندی کے فرائض کو خالصۃً للہ پوری دیانت و امانت اور عدل و انصاف کے ساتھ انجام دے۔

پھر تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بنیادی تعلیم کے پیشِ نظر عہدِ نبوی اور خلفاء راشدین میں جو اصول حکومت وضع کئے گئے وہ کتنے بلند اور کس درجہ محافظ انسانیت تھے۔

انھوں نے صرف انتخابی حکومت اور نظام شوریٰ ہی کی ہدایت پر عمل نہیں کیا، انھوں نے صرف عدل و انصاف ہی کی پابندی نہیں کی، بلکہ انھوں نے اقتصادی نظام کو بھی جمہوری رنگ دے دیا اور معاشرتی اصلاح کی بنیاد بھی مواخات و مساوات پر قایم کی۔

اس نے غلامی کو دور کیا، اس نے عورت کی پوزیشن کو بلند کیا، اس نے سرمایہ داری کی مخالفت کی اور اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی۔

پھر یہ سب کچھ زبانی یا کاغذی باتیں نہ تھیں بلکہ ان پر عمل ہوتا تھا اور اس سختی کے ساتھ کہ اگر کسی عامل کی طرف سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی تھی تو اسے فوراً معزول کر دیا جاتا۔

جمہوریت اسلام آج کل کی سی جمہوریت نہ تھی جس میں اقلیت کے جذبات ہمیشہ ٹھکرا دئے جاتے ہیں، بلکہ یہ وہ جمہوریت تھی جس میں غیر مسلم افراد مسلمانوں سے زیادہ امن و فراغ کی زندگی بسر کرتے تھے۔

جب حمص پر قبضہ ہو جانے کے بعد دوبارہ دشمن نے حملہ کی طیاریاں شروع کیں تو مسلمانوں نے اسے خالی کر دینا مناسب سمجھا، لیکن جب جانے لگے تو وہاں کے یہود و نصاریٰ سے جو رقم لاکھوں کی مقدار میں بطور جزیہ وصول ہوئی تھی وہ سب کی سب واپس کر دی، محض اس لئے کہ اب ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے تھے۔

مسلمانوں کے اس اخلاق کو دیکھ کر نصاریٰ ڈھاڑھیں مار مار کر رو رہے تھے اور یہود توراۃ کی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں قیصر کو حمص میں داخل نہ ہونے دیں گے۔

کیا تاریخ عالم میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

یہ تھی جمہوریت اسلام کی وہ روح جس نے لوگوں کے جسموں پر نہیں دلوں پہ حکومت کی اور اب یہ چیز محض فسانہ ہو کر رہ گئی … کرنے کا بند و بست نہ کر لیا جائے تمام دستور سازیاں لغو و بیکار ہیں۔

جب ملک شاہ سلجوقی تخت نشین ہوا تو اس کے چچیرے بھائی نے بھی اپنے آپ کو مستحق حکومت قرار دے کر جنگ شروع کر دی۔ نظام الملک طوسی (ملک شاہ کے وزیر) نے، امام موسیٰ رضا کے قبر پہ جا کر اپنے آقا کی فتح کے لئے دُعا مانگی۔ جب وہ دعا مانگ کر واپس آئے تو ملک نے پوچھا کہ آپ نے کیا دُعا کی تو انھوں نے کہا "آپ کی فتح و کامرانی کی دُعا"۔ ملک شاہ نے کہا دُعا میں نے بھی کی ہے مگر وہ یہ ہے کہ اگر میرا بھائی حکومت کا زیادہ اہل ہے تو اے میرے رب، میری جان اور میرا تاج مجھ سے واپس لیلے۔

گبن (عیسائی مورخ) ملک شاہ کے اس جذبہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ روح صرف اس لئے پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے یہاں حکومت کسی کا ذاتی حق نہیں تھی بلکہ خدا کی امانت تھی اور یہ امانت انھیں کو ملنا چاہئے جو اس کے حقیقی مستحق ہیں۔

پھر اس فریضہ کو جس خلوص و خشیت کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو آپ کی زبان سے بار بار یہی نکلتا تھا کہ "اللھم لاعلیّ ولالیِ" (یعنے خدا مجھے معاف کر دے) حالانکہ خدمت اسلام کے سلسلہ میں آپ کی قربانیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ تھا خشیت الٰہی و سیاست ملکی کا وہ امتزاج جو دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پاکستان کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ سے ایک استفسار

دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل یا دیول، سندھ کا ایک مشہور تاریخی شہر تھا جس کا ذکر یعقوبی، طبری، مسعودی، البیرونی نے بھی کیا ہے اور طبقاتِ ناصری، مراصد الاطلاع، آئینِ اکبری اور ساسانی تاریخ میں بھی اس کا حوالہ ملتا ہے۔ ان تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دریائے سندھ کا مشہور تجارتی بندرگاہ تھا جہاں عرب تاجر اکثر آیا کرتے تھے۔ بعد کو ۴۴ھ میں وہ یہاں فاتحانہ داخل ہوئے، لیکن کوئی حکومت قائم نہیں کی۔ اس کے تقریباً ۵۰ سال بعد جب ۹۳ھ میں محمد قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو عرب حکومت بھی قائم ہو گئی۔

عرب جغرافیئین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل دریائے مہران کے دہانہ پر واقع تھا۔ یاقوت نے یہاں کے بعض محدثین کا بھی ذکر کیا ہے اور اٹھارھویں صدی تک کے مغربی سیاحوں نے بھی اس کا نام لیا ہے۔ الیٹ نے دیبل، کراچی، ٹھٹھا، اور لاہوری بندر کو ایک ہی مقام قرار دیا ہے جو غالباً صحیح نہیں۔ ہیگ (HAIG) کا خیال ہے کہ نہر باگھار کے داہنے کنارے کاکر بکیرا کے کھنڈر دراصل دیبل کے کھنڈر ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے ضرور اس طرف توجہ کی ہوگی، اس لئے میں شکرگزار ہوں گا اگر وہ مجھے بتا سکیں کہ دیبل کی جائے وقوع کیا تھی اور اب اس کے کھنڈر کہاں ہیں اور کس نام سے موسوم ہیں۔ اسی کے ساتھ ممکن ہو تو دریائے مہران، باگھار اور کاکر بکیرا کے متعلق بھی اپنی تحقیق و تفتیش کے نتائج سے مطلع فرمائیں۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے

حرفِ آخر

کپور سپن

Kapur Spun.

ہی ہے

تیار کردہ۔ کپور سپننگ ملز۔ ڈاکخانہ رآن اینڈ سلک ملز۔ امرتسر

میرزا مظہر کے فارسی خطوط

(خلیق انجم)

خطوط اپنے لکھنے والے کی شخصیت و سیرت اور اُس کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل کا بہترین آئینہ ہوتے ہیں، کسی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ ممکن نہیں۔ خطوط کے بعد سوانح عمری کا درجہ ہے، لیکن بعض اوقات سوانح لکھتے ہوئے انسان حق اور صداقت سے کام نہیں لیتا۔ اور حقیقت پردوں میں چھپی رہ جاتی ہے، کبھی تو ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ سوانح نگار دروغ گوئی پر مجبور ہوتا ہے یا ارادتاً حقایق کی پردہ پوشی کرتا ہے، اور کبھی اُسے خود بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے اور لکھ رہا ہے، اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اس کے برعکس خطوط میں دروغ گوئی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، کیونکہ شاذ و نادر ہی مکتوب نگار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے خطوط صرف مکتوب الیہ ہی نہیں ہزاروں اور لاکھوں لوگ پڑھیں گے۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کے روز مرہ کے واقعات بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے، اور خطوط میں بیان کی گئی، یہ چھوٹی بڑی باتیں حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور مکتوب نگار کے ذہن کو سمجھنے میں ہماری ممد و معاون ہوتی ہیں۔

اگر کوئی صنفِ ادب فنِ تاریخ سے بہت زیادہ قریب ہے تو وہ خطوط نویسی ہے مورخ کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے جو اسے واقعہ کو ایک مخصوص عینک سے دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے، اُسے حاکمِ وقت کا خوف بھی ہوتا ہے، کبھی ایک مخصوص مذہب یا سیاسی جماعت کی طرفداری منظور ہوتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات وہ حقایق کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے کہ واقعات کی شکل و صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ خطوط میں انسان اپنے چہرے پر کتنا ہی دبیز نقاب کیوں نہ ڈال لے۔ حقیقت کی تلاش زیادہ مشکل نہیں ہوتی، اور مکتوب نگار کی کوششوں کے باوجود اُس کے ذہن کے تمام گوشے روشنی میں آجاتے ہیں۔

ہندوستان میں صدیوں قبل پہلے فارسی مکتوب نگاری نے باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی تھی، آج بھی ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی خطوط کے سیکڑوں مجموعے مل جاتے ہیں، جن میں خسرو، محمود گاواں، فیضی، ابو الفضل، ظہوری، چندر بھان برہمن، عالمگیر، نعمت خان عالی اور بیدل وغیرہ کے رقعات قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا مظہر کے خطوط بھی اس نقطۂ نظر سے اہم ہیں کہ ان کی مدد سے ہم مرزا کی شخصیت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مرزا رشد و ہدایت کے کام میں اس طرح مصروف رہے کہ انھیں زندگی بھر تصنیف و تالیف کی فرصت نہیں مل سکی۔ اسی لئے ان کا سرمایۂ تصانیف بہت مختصر ہے۔ انھوں نے خود ۱۱۶۱ھ میں بیس ہزار میں سے ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ اس انتخاب کا دیباچہ مرزا نے خود ہی لکھا تھا، اس دیباچہ سے دو اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مرزا نے شعر و شاعری میں دلچسپی صرف ہنگام جوانی میں لی تھی، اور آخری عمر میں یہ مشغلہ ترک کر دیا تھا۔ دوسرے ۱۱۵۵ھ میں مرزا کا ایک دیوان مرتب ہوا تھا، اور اس پر بھی مرزا صاحب نے دیباچہ لکھا تھا۔ مگر وہ دیوان اب نایاب ہے۔ البتہ دوسرا دیوان شایع ہو چکا ہے، انھوں نے فارسی اشعار کی ایک بیاض خریطۂ جواہر کے نام سے مرتب کی تھی، یہ بیاض بھی شایع ہو چکی ہے، اگرچہ اردو شاعری میں مرزا

کی وہی اہمیت ہے جو فلسفہ میں ارسطو یا افلاطون کی، لیکن انھوں نے اُردو شاعری کو ہمیشہ "دون مرتبہ" سمجھا۔ اور اسی لئے اُردو میں کبھی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں اور بیاضوں میں ان کا اُردو کلام بکھرا ہوا ہے۔ میں نے اُن کے تمام اُردو اشعار مرتب کئے ہیں جو میرے پی ایچ ڈی کے مقالے "مرزا مظہر جانجاناں کا عہد اور شاعری" میں شامل ہیں۔ عبدالرزاق قریشی نے بھی اپنی کتاب مرزا مظہر جانجاناں میں اُن کے اشعار مرتب کئے ہیں، فارسی اور اُردو میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے، صرف فارسی خطوط ہیں۔ البتہ تین اور نثری تحریریں ملتی ہیں۔ دیوان فارسی پر دیباچہ، غلام یحییٰ کی کتاب پر تقریظ اور وصیت نامہ ملتا ہے، اپنے خطوط کے بارے میں وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "دبستانِ تحقیق کے اس بے سواد میں کتاب کی تصنیف کی استعداد نہیں ہے۔ دوستوں نے بعض شریعت اور طریقت کے مسایل دریافت کئے تھے، ان کے جواب مکاتیب کے طور پر لکھے ہیں، جنھیں عزیزوں نے فراہم کیا ہے"[1]
>
> (بنام شاہ ابوالفتح)

آزاد لائبریری علی گڑھ میں رقعاتِ مرزا مظہر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں صرف ۲۳ خطوط ہیں۔ یہی ۲۳ خطوط شاہ غلام علی کی مقاماتِ مظہری[2] میں بھی شامل ہیں۔ غالباً مرزا کے مکتوبات کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو مرتب ہوا۔ بعد میں اضافے ہوتے رہے، مرزا کے مطبوعہ مکتوبات کے دو مجموعے ملتے ہیں کلماتِ طیبات اور رقعاتِ مرزا مظہر۔ کلماتِ طیبات میں حضرت غوث الثقلین، مرزا قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور شاہ غلام علی کے مکتوبات ہیں۔ مرزا کے مکتوبات کی کل تعداد ۸۸ ہے۔ کلماتِ طیبات کے آخر میں حضرتِ شیخ شہاب الدین سہروردی کے ایک رسالے "اسرار العارفین" کا فارسی ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار غالباً ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں مطبع العلوم مراد آباد سے زیر اہتمام محمد امجد علی مالک اخبار "نیر اعظم" ۶½" اور ۱۰" کے سایز پر شایع ہوئی تھی۔ مولوی حافظ علی مراد آبادی اس کے مرتب اور مولوی محمد قمر الدین مراد آبادی اور مولوی صدیق حسن سنبھلی نے اس کی تصحیح کی اور حاشئے لکھے۔ اس مجموعہ کا دوسرا اڈیشن ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں پھر اسی مطبع سے شایع ہوا۔ اس دفعہ مولوی قمر الدین کے ساتھ جو مولوی صدیق حسن کا نام تھا، وہ نکال دیا گیا۔ پہلے ایڈیشن میں منشی انوار حسین تسلیم کی تقریظ شامل ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ تقریظ بھی نکال دی گئی، اور سایز بھی بدل کر ۶½" × ۹½" کر دیا گیا۔ عبدالرزاق صاحب قریشی نے ایک اور ایڈیشن کا بھی ذکر کیا ہے، جو میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ ایڈیشن ۱۳۰۹ھ میں مجتبائی پریس دہلی سے حافظ عبداللہ کے زیر اہتمام چھپا تھا اور مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اس کی تصحیح کی تھی۔[3]

مرزا کے خطوط کا ایک اہم نسخہ رقعات کرامت سعلت شمس الدین حبیب اللہ، مرزا جان جاناں مظہر شہید رضی اللہ عنہ کے نام سے مطبع فتح الاخبار سے زیرِ اہتمام محمد عثمان خاں چھپا تھا۔ اس کا سنہ طباعت ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء ہے۔

اس نسخہ میں کل ۹۳ خطوط ہیں، جن میں دو بالکل نئے ہیں۔ اس نسخہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں چند خطوط کے علاوہ تمام پر مکتوب الیہم کے نام دئے گئے ہیں اور اس نوعیت کا یہ واحد نسخہ ہے۔

جاگیرداری دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف، تصنع اور مبالغہ آرائی ہوتی ہے۔ اس کا لازمی اثر خطوط نویسی پر بھی

---

[1] اس مقالہ میں مرزا کے تمام فارسی خطوط کے اقتباسات کا اُردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

[2] مقاماتِ مظہری کا اُردو ترجمہ ۱۹۱۰ء میں کتب قومی، منزل نقشبندیہ، کشمیری بازار، لاہور سے چھپا تھا۔ جس پر مترجم کا نام نہیں ہے۔ میں نے اس ترجمہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

[3] مرزا مظہر جانجاناں، ص ۲۴۸۔

پڑتا تھا۔ مرزا مظہر کے دور میں فارسی خطوط میں رنگینی عبارت، دور از قیاس تشبیہات، استعارات اور تکلف و تصنع ہوتا تھا اور عبارت اتنی مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی کہ اکثر و بیشتر مطلب خبط ہو جاتا تھا۔ اردو شاعری میں مرزا کو نقاش اول ریختہ کا اس لئے نہیں کہا گیا کہ انھوں نے شمالی ہند میں پہلی بار اردو میں شعر کہنا شروع کئے بلکہ یہ اعزاز اس لئے ملا ہے کہ انھوں نے ایہام جیسی غیر فطری چیز کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی۔ اور اپنی اس مخالف آواز کو باقاعدہ تحریک کی صورت دی انھوں نے اردو شاعری کی ان تاریک راہوں کو روشن و منور کیا ہے۔ جس پر گامزن ہو کر درد، میر، سودا، آتش اور غالب جیسے عظیم شاعروں نے بقائے دوام حاصل کی۔ اسی طرح مرزا صاحب نے فارسی اردو مکتوب نگاری میں بھی سادہ گوئی کی بنیاد رکھی اور اس کی اصلاح کرنا چاہی۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی طرح ڈالی تھی۔ اس کی ابتدا ستر، اسی سال قبل مرزا صاحب نے فارسی میں کی تھی۔ مرزا مظہر خواہ مخواہ طویل اور پر تکلف اور مبالغہ آمیز القابات کے خلاف تھے۔ وہ خود بھی سیدھے سادے القاب لکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ مرزا اکثر مخدوما، جان من اور برادر من جیسے القابات استعمال کرتے ہیں، وہ خط کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔ " بعد حمد وصلوٰۃ از فقیر مولوی صاحب مہربان سلمہ الرحمن مطالعہ فرمانید" اور کبھی صرف " حمد وصلوٰۃ " یا " حامداً ومصلیاً " یا باعث تحریر آنکہ سے خط شروع کرتے ہیں۔ مرزا بہت سادہ القاب لکھ کر فوراً مطلب کی بات پر آجاتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے جس میں انھوں نے بغیر کسی القاب یا توطیہ و تمہید کے مطلب کی بات کہنی شروع کر دی ہے۔ خود اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ میر اجنبی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"معلوم ہے کہ بھائی اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھتے۔ جو لکھتا ہے اس سے کہ دیں کہ یہ گھسا پٹا لقب (حقایق و معارف آگاہ) لکھنا چھوڑ دے۔ کیونکہ ہمارے اور آپ کے تعلقات میں ان الفاظ کی گنجایش نہیں ہے اور وہاں کے لوگوں کا سلیقۂ تحریر معلوم ہے۔ بے مزہ تکلف کو دخل نہ دیں۔ اس کے بعد اس طرح لکھیں کہ میر اجنبی کی طرف سے مرزا جانجاناں مطالعہ کریں اس کے بعد مطلب لکھیں۔"

میر سلمان نے غالباً مرزا کو پر تکلف القاب لکھا تھا۔ مرزا جواب میں انھیں لکھتے ہیں:

" امید ہے کہ مراسلات اور مخاطبات میں پرانی رسم کے مطابق لفظ " مرزا صاحب" پر اکتفا کریں گے۔"

مرزا خط کے مضمون میں بھی سادگی بیان کا پورا التزام کرتے ہیں۔ اکثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے ہوئے کسی انسان سے مخاطب ہیں۔ ان کے انداز تحریر میں وہی بے تکلفی اور بے ساختگی ہوتی ہے جو صرف گفتگو میں ممکن ہے۔ غالب کی خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے اس وقت اردو مکتوب نگاری کی اصلاح کی جب فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی نثر نے غالب کے لئے میدان ہموار کر دیا تھا، اور عوام کا ذہن اس اصلاح کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن مرزا کی وہی حالت تھی جو محمد شاہ تغلق کی تھی یعنی وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ جب انھوں نے فارسی مکتوب میں مشکل پسندی، نکتہ آفرینی، دقت مضامین او تکلف و تصنع کے خلاف آواز بلند کی اور خود ایسی فارسی نثر کے نمونے پیش کئے جن میں سادگی، صفائی، سلاست و فصاحت بے تکلفی و بے ساختگی اور روزمرہ کا لطف تھا۔ تو وہ فارسی داں طبقہ جس کا مزاج دربار اور امرا دونوں کی مصاحبت میں بنا اسے قبول نہ کر سکا۔

مواد کے اعتبار سے بھی ان خطوط کی بہت زیادہ اہمیت ہے، بعض خطوط میں مرزا نے تصوف کے مسایل پر روشنی ڈالی ہے خاص طور پر ابتدائی ۳۰ خطوط اس سلسلہ میں بہت اہم ہیں۔ پہلے خط میں اپنا حسب و نسب اور مختصر سے خاندانی حالات بیان ہیں، باقی خطوط میں مریدوں اور معتقدوں کے شبہات کے جوابات دئے ہیں۔ یہ خطوط مرزا کے مسلک، ان کے مقاصد او

نظریات کو سمجھنے کا بہترین اور واحد ذریعہ ہیں، انھیں خطوط میں تصوف کے اہم ترین مسایل جبر و اختیار، سماع، کرامات و فرق مصاوات، وحدت وجود، نسبت، علم حضوری و حصولی، اتباع اور ذکر جہر وغیرہ جیسے اہم موضوعات سے بحث کی گئی ہے ان کے عقاید کے سلسلہ میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہندو دھرم کے بارے میں ان کے نظریات ہیں۔ جن سے اُن کی ذہنی کشادگی، وسعت قلب اور انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں ہمیں اس کا علم ہے کہ مرزا اتباع سنت کے سخت پابند ہیں، وہاں انھیں خطوط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرکان ہند کے دین کو کفار عرب کی طرح بے اصل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک خط میں کسی مرید کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ نوع انسانی کی پیدایش کے آغاز میں رحمت الٰہی نے دنیا اور عاقبت کی اصلاح کے لئے برہما نامی ایک فرشتے کے ہاتھ ایک کتاب مسمیٰ بہ "وید" بھیجی تھی، مرزا صاحب وید کے چاروں دفتروں کی پوری تفصیل بیان کرکے لکھتے ہیں کہ ان ویدوں کو ماننے والے تمام فرقے خداوند تعالیٰ کی توحید پر متفق ہیں، اور دنیا کو حادث و مخلوق جانتے ہیں، دُنیا کے فنا ہونے، حشر جسمانی اور جزائے اعمال نیک و بد پر یقین رکھتے ہیں، اور جہاں تک ان لوگوں کی بت پرستی کا تعلق ہے تو یہ لوگ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و مکاں پر تصرف رکھتے ہیں یا بعض کاملوں کی روحیں جن کا جسموں سے ترک تعلق کے بعد بھی اس کائنات پر تصرف باقی ہے یا بعض ایسے زندہ لوگ جو ان لوگوں کے خیال میں حضرت خضر کی طرح زندہ جاوید ہیں، ان کے بت بناکر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب سے کچھ مدت کے بعد صاحب صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں۔ مرزا کے خیال سے ہندوؤں کا یہ عمل صوفیوں کے ذکر رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان صوفی اپنے پیر کا بت نہیں تراشتے، کفار عرب کی بت پرستی اہل ہند کی بت پرستی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کیونکہ اہل عرب بتوں کو اپنی ذات میں موثر اور متصرف جانتے تھے۔ ان تمام شواہد و دلایل کی روشنی میں مرزا یہ یقین رکھتے تھے کہ ہندو دھرم خدا کا بھیجا ہوا ہے جو ظہور اسلام کے بعد منسوخ ہوگیا۔ رام چندر اور کرشن جی وغیرہ کی عزت کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ممکن ہے یہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوں، اسی خط میں مرزا نے یہ بھی لکھا ہے کہ تناسخ پر اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا مرزا کی یہ ذہنی کشادگی محض خیال اور فکر تک محدود نہیں تھی۔ عملی زندگی میں بھی ہندوؤں سے اُن کا ہمدردانہ اور پرخلوص رشتہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں بہت لوگ ہندو تھے۔ جن میں بساون لال بیدار اور کشن چند مجروح کے نام قابل ذکر ہیں۔

مقامات مظہری اور معمولات مظہریہ میں بہت سے ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے مرزا کے توکل اور استغنا کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کی دولت کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا۔ جب کبھی ان لوگوں نے مرزا کی خدمت میں کوئی پیش کش کی۔ مرزا نے کمال استغنا کے ساتھ انھیں ٹھکرا دیا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ جس مکان میں مرزا کی شہادت ہوئی ہے وہ کیول رام نامی ایک بنئے نے ان کے لئے بنوایا تھا۔ ظاہر ہے کہ قبولیت کا یہ شرف صرف دلی تعلق کی وجہ سے بخشا گیا ہوگا۔ مرزا نے خطوط میں اکثر لوگوں کی سفارش کی ہے بلکہ ایک خط میں اپنے ہمشیرزادوں کی سفارش بھی کی ہے۔ لیکن اس خط میں اُن کا لہجہ اور الفاظ اتنے زوردار اور موثر نہیں ہیں جتنے کہ اُس خط میں ہیں۔ جو انھوں نے برج لال نامی ایک نوجوان کی سفارش میں صرف کئے ہیں، وہ محمد قاسم کے نام ایک خط میں برج لال کی تعریف و توصیف اور ملازمت کی سفارش کے بعد لکھتے ہیں:۔

"تم کو معلوم ہے کہ ہم نے اس اہتمام سے تم سے کسی کا ذکر نہیں کیا۔ اور ہم کو مبالغہ کی عادت نہیں"۔

ان خطوط میں سے ہمیں مرزا کے تصور اخلاق کا علم ہوتا ہے، انھوں نے اکثر خطوں میں اپنے مریدوں کو نصیحتیں کی ہیں جو زندگی میں ان کے اپنے طرز عمل کی آئینہ دار ہیں، وہ اپنے ایک مرید شاہ محمد سالم کو لکھتے ہیں:۔

"اپنی بدخلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی تمہارے طریقہ کی طرف آئے تو اس سے خدمت لینے کی بجائے خود اُس کی

خدمت کرو، ہاں اگر وہ محبت کے غلبہ سے خود تمہاری خدمت کرے تو دوسری بات ہے۔"

آخری عمر میں مرزا صاحب نے قیمتی لباس پہننا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب ان کے مرید محمد قاسم نے انھیں قیمتی کپڑے کے دو تھان بھیجے اور منت سماجت کی کہ مرزا اس کا لباس ضرور پہنیں، تو وہ انکار نہ کر سکے۔ مرید کے اصرار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"اب فقیر کم قیمت کا لباس استعمال کرتا ہے، چونکہ تم نے بہت سماجت کی ہے۔ اس لئے تمہاری خاطر سے پہنوں گا ورنہ عدم قبول کی صورت میں تمھیں تکلیف ہوگی۔"

ایک اور خط میں مرزا صاحب، صاحبزادہ مرید حسین کو لکھتے ہیں:۔

"فقیر نے خواب میں معلوم کیا ہے کہ تمہاری والدہ باطن میں تم سے ناخوش ہیں۔ والدہ کی ناراضگی آخرت اور دنیا دونوں میں نقصان کا باعث ہے۔"

ایک اور خط میں مرزا نے کسی خاتون مرید کو لکھا ہے:۔

"اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ پیار اور شفقت سے زندگی گزارو، تو کوئی تم سے برائی نہیں کریگا شوہر کی خدمت، اور اطاعت کی پوری کوشش کرنا چاہئے..... غصہ و غضب پی جانا چاہئے۔"

مرزا کی بیوی کو سودا ہو گیا تھا، لیکن انھیں طلاق دینا یا اُن سے کنارہ کشی کرنا ان کے مسلک اور آئین کے خلاف تھا۔ اگرچہ یہ خاتون زندگی بھر دردِ سر بنی رہیں۔ مرزا کی جبیں پر کبھی شکن نہیں آئی۔ ہمیشہ ان کی خاطر داری اور دیکھ بھال میں کوشاں رہے ایک مرتبہ وہ پانی پت گئیں، اور غالباً قاضی ثناء اللہ کے ہاں قیام کیا، مرزا ان کے بارے میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"تمھیں چاہئے کہ جب وہ (مرزا کی بیوی) پہونچیں تو ان کی دلجوئی اور خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اور وعظ و نصیحت میں ان پر سختی نہ کرنا، ان کی بہت دلجوئی کرنا، اگر فقیر کو پیٹھ پیچھے برا کہیں تو ہرگز ان سے بددل نہ ہونا، کیونکہ ہماری اور تمہاری خیریت اسی میں ہے۔"

مرزا اتنے وسیع القلب اور انسان دوست تھے کہ کبھی کسی انسان کا دل دکھانا اور اسے معمولی سی تکلیف دینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حد تو یہ تھی کہ اگر کسی انسان کا زہد اور تقویٰ کسی دوسرے آدمی کی تکلیف کا باعث ہو تو وہ ایسے زہد سے دامن بچانا پسند کرتے تھے۔ قاضی ثناء اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرے بھائی، عجیب بات ہے، پانی پت کا ہر شخص تمہاری شکایتوں سے بھرا ہوا آتا ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرتے ہو اگر تمہاری سچائی اور دیانت لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسی راستی سے باز آؤ۔"

وہ کسی سے ناراض بھی نہیں ہوتے تھے اور اگر کسی وجہ سے تھوڑی بہت رنجش ہو گئی۔ تو معمولی معذرت سے دل صاف کر لیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:۔

"فقیر تمہارے اندازِ تحریر سے ناراض تھا، چونکہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا، اس لئے میں نے خود کو زبردستی باز رکھا اور تمہارے حق میں دعائے خیر کی۔ تاکہ خاطر جمع ہو، اب جو تم نے معذرت کی ہے دل صاف تو ہو گیا، ہم نے معاف کر دیا۔ خاطر جمع رکھو۔"

محمد قاسم کے نام ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں:۔

"فقیر دل کی ناراضگی تو ایک مٹھی خاک کی طرح ہوتی ہے، جو دریا میں ڈال دی جائے، اب مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ تم نے اس خط میں حد سے زیادہ معذرت کی ہے۔ اس نے میرے دل کا غبار دھو دیا ہے، بے فکر رہو۔"

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں مرزا کے بارے میں لکھا ہے:۔

"مرزا صاحب کی تحصیل عالمانہ نہ تھی، مگر علم حدیث با اصول پڑھا تھا۔"[1]

یہ بات صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے مرزا سے ذاتی رنجش ہو، مرزا نے ان رقعات میں جس انداز سے تصوف کے مسایل پر روشنی ڈالی ہے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ ان کی علمیت اور قابلیت کی دلیل ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ شواہد موجود ہیں۔ جن سے ان کے علم و فضل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں ان کتابوں کے نام جو مرزا کے زیر مطالعہ رہیں اور جن کا حوالہ مرزا نے اپنے خطوط میں دیا ہے۔ اگر ان کتابوں کی فہرست بنائی جائے تو یہ ایک طویل فہرست ہوگی، اور پھر ظاہر ہے کہ مرزا نے صرف انھیں کتابوں کا مطالعہ نہ کیا ہوگا۔

ان رقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مرزا کے مریدوں میں سب سے زیادہ تعداد روہیلوں کی تھی۔ کتنے روہیلے ان کے مرید تھے اور روہیلوں کو ان سے کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ مرزا کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ روہیلکھنڈ کے کسی شہر سے محمد احسان احمدی کو لکھتے ہیں:-

> "اخذ طریقہ کے لئے روہیلوں کا اتنا ہجوم ہے کہ تمام دن توجہ دینے سے فرصت نہیں ملتی..... فقیر کے پہونچنے کی خبر سن کر یہ لوگ دور دراز علاقوں سے احرام بستہ آتے ہیں..... سنبھل اور امروہہ سے لے کر شاہجہاں پور تک تمام منزلوں میں ٹولی ٹولی بنا کر ایک گروہ نے قوم روہیلہ میں سے اکثر اور ہندوستانی لوگوں میں سے کم تر نے اخذ طریقہ کیا ہے..... ان میں سے ایک جماعت ساتھ آتی ہے اور میرے ہمراہ دہلی جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

مرزا نے اکثر خطوط میں ان روہیلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہی روہیلے مغل حکومت کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ نجف خاں جب برسر اقتدار آیا تو اس نے ان سے نجات پانے کی کوشش کی۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان روہیلوں کی اچھی خاصی تعداد دہلی میں آباد ہوگئی تھی۔ جن میں اکثر آستانۂ مظہر سے وابستہ تھے۔ اور مرزا کی وجہ سے دہلی میں روہیلوں کی آمد و رفت برابر جاری تھی۔ اس لئے نجف خاں کو مرزا کے قتل کی سازش میں حصہ لینا پڑا۔ اس کی ایما اور سازش سے، محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کی رات کو ایک مغل بچے نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ وہ زخمی ہوگئے اور تین دن زندہ رہ کر انتقال کر گئے۔ اس قتل میں نجف کے مذہبی تعصب کو بھی دخل تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جاگیرداری دور میں خانقاہ کا ایک اہم رول رہا تھا۔ چونکہ عوام اور خود امرا دونوں کے دل و دماغ پر اہل خانقاہ کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لئے بادشاہوں کو ہمیشہ یہ خوف رہتا تھا کہ ان برگزیدہ ہستیوں کے اشارہ ابرو سے حکومت کا تختہ پلٹا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہمیشہ اہل خانقاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان کی عام زندگی میں جو زوال آیا، اس کے اثر سے معدودے چند کو چھوڑ کر باقی خانقاہیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، اور یہ بھی دنیاوی عیش و عشرت، شعر و شراب، رقص و سرود اور غیر اخلاقی اور غیر فطری حرکتوں کی آماجگاہ بن گئیں۔ مرزا کی خانقاہ کا شمار ان معدودے چند خانقاہوں میں ہے جو نہ صرف اس زوال کے اثر سے محفوظ رہیں، بلکہ جنھوں نے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن کئے اور انسان کی فلاح و بہبودی کے لئے ہر ممکن کام کیا، مرزا تمام سیاسی واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ ان کے خطوط میں اکثر ان واقعات کا ذکر آگیا ہے، جو تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں۔ مرزا نے بعض سیاسی واقعات پر تبصرہ کیا ہے، نواب عماد الملک اور غلام عسکری خاں کے نام جو مرزا کے خطوط ہیں وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ انسانی فلاح و بہبودی کے لئے سیاست میں حصہ لینے کو مرزا ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے نواب کو کئی خطوط میں سیاسی مشورے دئے ہیں۔ —— اس مختصر سے مقالے میں بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جن سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ مرزا کے سوانح اور اس دور کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ خطوط کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے مرزا کے تمام خطوط کا اردو ترجمہ کر دیا ہے، جو مکتبہ برہان دہلی سے شایع ہو رہے ہیں۔

---

[1] آب حیات (مبارک علی ایڈیشن) ص ۳۷۰۔

شاہِ عالم کا ہندوستان

۱۱۷۳ھ تا ۱۲۲۱ھ

(تاریخ ہند کا نہایت پُر آشوب زمانہ)

(خان رشید)

سکھوں، مرہٹوں، ابدالیوں اور جاٹوں کی لوٹ مار نے جس "سماج" کو جنم دیا اس کی رگ رگ میں خودسری اور مطلق العنانی کا زہر کچھ اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ کوئی تدبیر اس کی سمیّت کو زائل نہ کرسکی اور دلّی اُجڑ گئی۔ بقول میر ؎

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ　　بود فردِ دفترِ احوال صاحب خانۂ

جو علاقے دلّی سے جتنے قریب تھے وہ اتنے ہی زیادہ متاثر ہوئے، لیکن دور دراز گوشے بھی محفوظ نہ رہ سکے، ادبار کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں دو افراد بھی ایسے نہ رہ گئے تھے جنھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے ہوں —— اسی ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کے افق پر ایک اور "آفتاب" نمودار ہوا۔ مگر یہ صرف تخلص کا آفتاب تھا۔ اس میں جوت ناپید تھی، احمد شاہ ابدالی نے جاتے جاتے شاہِ عالم ثانی کو بادشاہ مقرر کیا۔ مگر اس کی شاہی محض "تہمت" ہی ثابت ہوئی۔ نام کو شاہ عالم تھا، مگر حقایق نے جلد ایک مثل مشہور کردی کہ —— "بادشاہی شاہ عالم، از دہلی تا پالم" —— سکّہ اس کا ہی چلتا رہا جس پر

حامیٔ دینِ محمدؐ باشد از فضل الٰہ　　بادشاہ ہفت کشور شاہ عالم بادشاہ —— کندہ ہوتا تھا۔

مگر نہ وہ بادشاہ ہفت کشور بن سکا نہ حامیِ دینِ محمدؐ اور ملک میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں ہی کا حکم چلتا رہا۔ شاہ عالم دس برس تک الہ آباد میں رہا۔ معرکۂ بکسر کے بعد شاہ عالم نے بنگال کی دیوانی ۲۶ لاکھ سالانہ کے عوض انگریزوں کے نام لکھ دی۔ جہانداری کی سکت نہ رہی تو پنشن خواری غنیمت نظر آئی۔ ہند کے مشرق و مغرب میں حکمرانوں کے طلوع و غروب کا تماشہ جاری تھا۔ شمالی اور وسطی ہند سے کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی۔ لیکن جنوبی ہند میں اسی زمانہ میں حیدر علی نے سرکش پالیگاروں اور مرہٹوں کے فساد کو فرو کرکے ۱۱۷۵ھ میں سلطنت خداداد میسور کی بنیاد رکھی۔ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں اسے بدنور کے مقام پر سب سے بڑی اور اہم فتح حاصل ہوئی۔ مالابار پر قبضہ کرنے کے بعد حیدر علی نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں چیتلدرگ اور شاہنور پر چڑھائی کی۔ ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں مرہٹوں نے حیدر علی پر فوج کشی کی۔ دو سال جنگ جاری رہی آخر حیدر علی نے صلح کرلی۔ انگریز ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء میں بکسر سے فراغت پانے کے بعد شمالی ہند میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے اور اب انھوں نے حیدر علی کی طرف توجہ کی جسے وہ اپنے اقتدار کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ والا جاہ محمد علی والی ارکاٹ اور نظام علی خاں، نظام دوم والی حیدرآباد، انگریزوں کے ساتھ ہوگئے۔ انگریزوں نے نظام سے سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض میسور کے تمام علاقے کی سند اپنے نام لکھوالی والا جاہ محمد علی کو ارکاٹ کا آزاد حکمراں اور انگریزوں کو اس کا ایجنٹ تسلیم کیا گیا۔ مرہٹے بھی انگریزوں کے ساتھ ہوگئے۔ اب متحدہ فوجوں نے میسور پر حملہ کردیا۔ اسی دوران میں ٹیپو سلطان نے مدراس میں انگریزوں کا محاصرہ کرلیا، قریب تھا کہ ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے نجات مل جاتی

لیکن حیدر علی سے منسوب ایک جعلی خط نے ٹیپو کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا اور انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کا انتقال ہوا۔ لیکن مرنے سے پہلے اس نے احیائے دین کی ایک ایسی تحریک پیدا کر دی تھی جس کے تحت جنوبی ہند میں مذہب اور ملکی مفاد سے وابستگی بڑھ گئی تھی۔ غیر مسلموں اور انگریزوں کی دشمنی نے اسے اور ہوا دی۔ جنوبی ہند کی شاعری میں اسکے نمایاں نقوش موجود ہیں۔ دکن کی اس شاعری کے علاوہ بھی جس کے مراکز حیدر آباد اور گولکنڈہ تھے، جنوبی ہند کے مدراس اور ویلور جیسے دور دراز گوشوں میں بھی یہ رجحان نمایاں تھا۔ تاہم جنوبی ہند میں یگانگت اور یک جہتی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلافات کو مفاد پرست قوموں نے خوب بھڑکایا۔ نام نہاد علماء نے وقت کی آواز کے خلاف تفرقہ پردازی کو شیوہ بنایا۔ کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانا تو دور کی بات ہے، بات بات پر مسلمانوں کو بلا تکلف دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کے فتوے صادر کیے۔ صوفیہ نے تبلیغ کی طرف توجہ کی، لیکن دین کی بدحالی ان سے بھی دیکھی نہ گئی اور انھوں نے حسب موقع اس باب میں بھی کوشش کی کہ غلط روایات اور گمراہ کن نظریات سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر ان کے سامنے اسلام کی حقیقی روح کو بے نقاب کریں۔ ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۸ء میں ویلور کے ایک شاعر شاہ کمال الدین کمال نے اسی مقصد کے تحت قطب شاہی شاعر بلاقی کے معراج نامے سے غلط روایات کو خارج کر کے خود بھی معراج نامہ لکھا، جس کے اشعار اس قسم کے ہیں:-

جس کو ہے اللہ اکبر اسم ذات
اس کو لایق ہے کمالات و صفات

کمال کی ایک مثنوی فقہ پر بھی ہے۔ یہ اور اس دور کی ایسی تمام مثنویاں انھیں مذہبی اختلافات کا ردِ عمل ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔

۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء کو فتح علی ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ میر صادق اور پورنیا دیوان اور وزیر ہوئے۔ تاریخ فتوحات برطانیہ میں ملا فیروز اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

سرانِ سپہ محفل آراستند
ہمہ دست بر سینہ برخاستند
بگفتند کاے شاہ گردوں سریر
ہمہ چاکر اینم فرماں پذیر،
چو سلطاں لقب یافتی از نخست
کنوں تخت و تاج شہی زاں تست
پسر در جہاں آں بود نیک نام
کہ برتر نہد از پدر چند گام

آخر میں دعا دی ہے کہ

سر حاسداں زیر پائے تو باد،
ہمہ عیش عالم برائے تو باد

لیکن سلطان ٹیپو کو سکون و اطمینان کا ایک دن بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ میں ٹیپو کے لے پالک بیٹے ایاز خاں نے انگریزوں سے سازش کر کے بغاوت کر دی۔ کوڑیال بندر اور بھٹکل بلا مزاحمت انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ دوسری طرف اپنے شامیانے دار الخلافہ یعنی سرنگا پٹم پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور تیسری جانب نواب کڈپہ عبد الحلیم خاں کے بھائی نے مچھلی بندر میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ٹیپو جو قوم و ملک کے درخشاں مستقبل کی امید پر انتھک کوششوں سے اپنے ذاتی آرام کو حرام کئے ہوئے تھا، نادان اہل ملک کی سازشوں اور خود غرضیوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ ٹیپو نے میسور کی خوشحالی اور از سر نو تعمیر کے لئے بے مثل اصلاحی اقدام کئے مگر سازشوں کی فضا نے بار آور نہ ہونے دیا۔ ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء میں سروش غیبی نے "حیدر نگر گرفتہ" کا غلغلہ بلند کیا کہ ٹیپو نے انگریزوں سے حیدر نگر واپس چھین لیا۔ اور اسی سال کڈلور میں انگریزوں سے جنگ کی۔ فرانسیسی، ٹیپو کے ساتھ تھے۔ ٹیپو کے حملے اس قدر شدید تھے کہ انگریزوں نے زچ ہو کر مجبوراً اسی کی شرائط پر صلح کر لی مگر ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ ۸ مارچ ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء کو ان کے اشارے پر نظام اور مرہٹوں نے ایت گیر میں معاہدہ کر کے اچانک مملکت خداداد پر دھاوا بول دیا۔ ٹیپو نے نظام کو لاکھ مذہب و ملت کا واسطہ دیا، مابین بیٹی بیٹوں کی شادی کی پیشکش کی اور اسے اپنا حلیف بنا کر انگریزوں اور مفسد مرہٹوں کا

قلع قمع کرنا چاہا لیکن نظام رضامند نہ ہوا۔ بہرکیف جنگ ہوئی اور ٹیپو کو کامیابی ہوئی۔ یہ جنگ سنہ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۴ع سے سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ع تک جاری رہی۔ شاہ نور کی فتح کے فوراً بعد ٹیپو نے فوج کے دو حصے کرکے ایک حصہ کو حیدرآباد اور دوسرے حصہ کو پونہ کی مہم پر روانہ کر دیا تھا اور خود سرنگا پٹم کی طرف توجہ کی جہاں محمد علی کمیدان جیسے رکن رکین سلطنت نے نمک حرامی کرکے قبضہ جما لیا تھا۔ جائے فرار نہ دیکھ کر محمد علی کمیدان نے خودکشی کر لی۔ تاہم طوطا چشم امراء کی اب بھی کمی نہ تھی۔ زوال و انحطاط کی وبا سے اعتبار معدوم ہو چکا تھا۔

بہرحال سرنگا پٹم سے فراغت کے بعد افواج کی کمک، اور رسد کا انتظام کرنے کے لئے شاہ نور میں قیام کیا۔ اس انتظام کی خبر نے حیدرآباد اور پونہ میں کھلبلی پیدا کر دی۔ سلطانی امیر برہان الدین نے ہنکاپور اور مصری کوٹہ پر قبضہ کر لیا اور سید حمید اور سید غفار نے مندری ورگ پر دھاوا بولا۔ خود سلطان ٹیپو کے زیر کمان فوج ہری پنڈت پھڑکیا کے عساکر کی طرف بڑھی۔ اس جنگ کا مفصل حال فتح نامہ ٹیپو سلطان موجود ہے اور مصنف کا دعوے ہے کہ ؎

جو کچھ میں لکھا ہوں یو سب بے اختلاف — ہیں سب سچ نہیں اس میں یو برخلاف
جو کوئی یہ سخنہا کوں جانے دروغ — نہیں اس میں بھی نور دل کا فروغ
سخن سب میں روشن تراز آفتاب — ہیں خفاشس منکر نہیں اس میں آب

اس مثنوی کا گمنام مصنف کچھ اس درجہ نالاں ہے کہ وہ مرہٹوں اور عساکر نظام کے سربراہوں کو بلا تکلف گالیاں دیتا ہے۔ مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

عجائب سنو دوستو داستاں — کہ جس کے بیاں میں ہے قاصر زباں
مراہٹہ مغل فوج سب جمع کر — خوشی سات سلطاں کی سن بدخبر
کیئے سب نے یوں شرط سوگند سات — لیویں ملک جلدی سوں اب ہات ہات
سبھی مال ملک و دریا و حصار — دونوں لیویں ہم بانٹ ہے یہ قرار
حجام للی راستہ بھول کر — بھی بالاجی پنڈت سگ بدسیر
ہری پنڈت کے لڑکے فاجیرہ — لے سنگات افواج سب باکرہ

....

مثنوی کے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ع کے فیصلہ کن معرکے کا مذکور ہے۔ اس وقت سلطان شاہ نور سے سرنگاپٹم آ چکا تھا ؎

پٹن بیچ پہونچی ہے جب یہ خبر — کہ لڑنے کو باندھے ہیں رنداں کمر
خوشی سات سلطان سب فوج لے — ملاقات خاطر انو کی چلے

....

خبر سن یہ حجام للی نے او — اپس ہات سے آبرو اپنی کھو
کیا مشورت بخشی بیگم سے سات — میں سمجھا تھا کچھ ہوئی کچھ اور بات
اتا کیا کروں گم کہاں بھاگ جاؤں — نہیں ہے مجھے سر چھپانے کو ٹھاؤں

دراصل سلطنت خداداد کی اندرونی شورشوں اور بغاوتوں نے نظام اور مرہٹوں کے حوصلے بلند کر دئے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ آپ ٹیپو کو شکست دے کر اس کی مملکت کو آپس میں تقسیم کر لیں گے، لیکن جب سلطان نے بیک وقت تین چار محاذوں پر نہ صرف لڑنے کا فیصلہ بلکہ خود آگے بڑھ کر حملہ آور ہوا تو مخالفوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اسی دوران، اندرونی شورشیں فرو ہو گئیں اور جب سلطان اس

اتحادی محاذ کی طرف بڑھا تو مخالف افواج میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ سلطانی فوج نے کوچ پر کوچ کر کے تنگ بھدرا کو پار کیا اور اس مقام کا رخ کیا جہاں ہری پنڈت اور نظام کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں ؎

اوتر تنگ بھدرا کوں لے سات فوج — چلے جوں کہ دریا پہ چلتی ہے موج
خبر سُن مراہٹہ مغل تلملے — لگے رونے یک یک کے لگ لگ گلے

آخر مغل سردار ڈر کر حیدر آباد کی طرف بھاگے اور بالاجی نے پونہ کی راہ لی ؎

گیا بھاگ کر حیدر آباد تب — دیا ننگ ناموس برباد سب
بھی بالاجی کر اپنی دھوتی خراب — چھپا جاکے پونہ میں جلدی شتاب
ہری پنڈت و راستہ ہولکر — بھی دوسرے خراں سب یہ سُن کر خبر

سربراہوں کی روانگی سے افواج میں بددلی پھیل چکی تھی اور وہ جم کر مقابلہ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ سلطانی فوج نے بمشکل انھیں گھیرا اور شبخون مارتی ہوئی مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئی ؎

بھی سلطاں کئے اپنو شبخون چار — دلے ہو کے ہشیار وہ بدشعار

غفار حکیم خاں نائطہ اہل وعیال کو لے کر بھاگا۔ ہری پنت کا بیٹا اور اس کے اہل وعیال نیز دیگر کتب تاریخ کے مطابق ہلکر اور بہت سے سرداروں کے اہل وعیال بھی گرفتار ہوئے، لیکن سلطان نے انتہائی سیر چشمی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں پورے اعزاز واحترام کے ساتھ پالکیوں میں بٹھا کر مرہٹوں کے پاس پونہ بھیج دیا۔ دربار پونہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ اور بعد کے دور انگریزوں کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ سلطان پر جب انگریز فوج کشی کریں تو کہیں مرہٹے اس کے ساتھ نہ ہو جائیں اس لئے انھوں نے مختلف حیلوں سے ہلکر اور سندھیا کو شمال کی طرف الجھا دیا۔ بہرحال اس مثنوی میں سلطان کی اس فیاضی کے واقعہ کو اس طرح سراہا گیا ہے:۔

کئے معاف سلطاں نے سب لوٹ کوں — مگر فیل گھوڑے سبھی اونٹ کوں
دلے قیمت کوں ان سے خریدی کئے — بھی انعام ہر یک کوں بجد دئے
اُوتر کر منادی کئے جا بجا — کسی کا نہ کوئی مال لیوے چھپا

مرہٹوں کی جو فوجیں بھاگ سکیں ان میں ہری پنڈت اور اس کے رفقائے خاص بھی تھے ؎

نہ لا تاب جنگ و جدل بھاگ کر — اوترنے کوں جاتے ہیں کشنا اوپر (دریائے کرشنا)

انھوں نے قلعہ بہادر بندہ کا رخ کیا جسے سلطان نے جلد ہی فتح کر لیا۔ ہری پنڈت کی افواج قلعہ سے جا چکی تھیں۔ اہلِ قلعہ کو امان دی گئی ؎

اماں دی قلعہ پر سوں سب کو دوتار — کتوں پر کئے نور دیں آشکار

ہری پنڈت اور ہلکر نے اہلِ قلعہ سے خفیہ ساز باز کی اور انھیں سلطانی افواج پر شبخون کے لئے آمادہ کرنا چاہا ؎

ہری پنڈت و راستہ ہولکر — بلا ان کو پوچھا کہو کیا خبر،
ہمیں آئے تھے تم نے جلدی کئے — ہو کیوں گھابڑے تم قلعہ کوں دئے

مگر اہلِ قلعہ نے جو سلطان کی رواداری اور بلند نظری سے متاثر تھے انھیں بہت بُرا بھلا کہا۔ پھر بھی مرہٹے ان سے رسد اور ہتھیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور جنگلوں میں جا چھپے۔ سلطانی لشکر برابر ان کا تعاقب کرتا رہا، لیکن وہ جم کر مقابلہ نہ کرتے تھے اور گوناگوں شبخون مارتے رہتے تھے۔ پھر بھی سلطانی افواج نے ان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا ؎

ہری پنڈت لڑنے کی نالا کے تاب — بچا پگڑی اپنی سب سے شتاب

اُسی طرح سوں راستہ ہولکر　　گئے بھاگتے لومڑیاں ہار کر
ہری پنڈت لے سات سب خاص و عام　　گئے جا کے نزدیک کشنا مقام،

وہاں سراسیمگی اور فاقہ کشی کے علاوہ انھیں وبائی امراض نے گھیر لیا ۔ ؎

کئی ہول دل کے مرض سے مرے　　دِگئی تپ و لرزہ سوں جانکوں دئے

اسی اثناء میں سلطانی افواج کی آمد آمد کی خبر نے بھگدڑ مچادی۔ اور انھوں نے طلابہ کی راہ لی۔ طلابہ کے لوگوں نے انھیں سلطان سے صلح کرنے کا مشورہ دیا ؎

بھلا ہے کسی طرح سلطاں کے ساتھ　　صلح کریو آفت سوں پانا نجات

سلطان خود بھی ان کے تعاقب سے پریشان ہو چکا تھا۔ معرکۂ طلابہ میں اس نے ایک اور حربہ استعمال کیا اور مرہٹوں کی ضعیف الاعتقادی سے فایدہ اُٹھایا۔ اس نے کنجڑیوں اور ہیجڑوں کو بلاکر اس کام پر مامور کیا کہ وہ زنانہ لباس میں اجناس کی خرید و فروخت کے بہانہ مرہٹہ لشکر میں جائیں اور رات کے وقت قریبی جنگل میں چھپ کر وہاں سے "شہاب" سر کریں۔ جب یہ شہاب آسمان سے مرہٹہ لشکر پر گرے تو انھوں نے اسے بلائے آسمانی سمجھا۔ زنانہ لباس میں دو ہیجڑے پکڑے گئے جنھوں نے ہری پنڈت اور ہلکر کو بتایا کہ تم بھاگتے پھرتے ہو اس لئے ؎

نپٹ ہو کے لاچار سلطاں دیں　　بلاکر کنجڑیاں و ہیجڑیوں کتیں
تمھارے سوں لڑنے کوں میداں کے سات　　روانہ گئے دے شہاباں سنگات
شباشب ہمیں لڑنے تم سات آئے　　طلابہ کے اوپر شہاباں چلائے
شہاباں کا آواز سنتے تم　　گئے سب حواس ہائے عزرہ کو تم؟

تاہم انھیں یقین نہ آتا تھا اور وہ اسے دیوتاؤں کے قہر سے منسوب کرتے تھے۔ یہ 'شہاب' دراصل آتشبازی کی قسم کی کوئی چیز تھی جسے راکٹ کی طرح دور سے سر کیا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطانی لشکر سے بدر الزماں خاں اور محمد رضا خاں خطیب مزید گفتگو کے لئے مرہٹہ لشکر میں گئے۔ آخر صلح ہو گئی اور مرہٹے سوا مادھو راؤ، بالاجی پیشوا کے پاس چلے گئے۔

ٹیپو سلطان نے اپنے دشمن ہری پنڈت پھڑکیا کی جوانمردی پر اسے کنجن گڈھ کا علاقہ بطور جاگیر دے دیا۔ اور اسی کی سفارش پر عبدالحکیم خاں نائطہ کو معافی دے کر شاہنور کی ریاست اسے دوبارہ عطا کر دی۔ یہی ہری پنڈت پھڑکیا ہے، جس نے بہت جلد سلطان کے سارے احسانات فراموش کر دئے اور اس کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔

اودھ

یہی وہ زمانہ ہے جب آصف الدولہ کے زیر اقتدار صوبۂ اودھ روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ دولت کی فراوانی اور عیش و نشاط کی فضا نے شعر و شاعری کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ خود آصف الدولہ، سوزؔ کی شاگردی کے باوجود اپنی شاعری میں سوز و گداز اور اثر آفرینی سے محروم رہے۔ بہت کہا تو صرف اس قدر کہ ؎

گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں　　کسی کا جو نقشِ قدم دیکھتے ہیں

ورنہ حقیقت یہی تھی کہ ؎

بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ　　تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

عیش و عشرت کے ماحول میں درد و غم کے بیانات بے وقت کی راگنی بن گئے۔ خود دہلوی شعرا، بھی دلّی اُجاڑ کر لکھنؤ پہونچے تو اسی رنگ میں رنگ گئے۔ فراغت اور اطمینان نے ان کے قویٰ اتنے مضمحل کر دئے کہ ہندوستان کی ابتری اور بےچینی انھیں ذرا بے قرار

نہ کرسکی اور جب روہیلوں کو تباہ کر دیا گیا تو شادیانے بجائے گئے۔ ادھر دلّی کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ ضابطہ خاں، شاہ عالم سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس نے بلا تکلف مرہٹوں سے ساز باز کی اور دہلی پر حملہ کر دیا۔ متھرا کی سڑک پر تغلق آباد کے قریب چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ان ہی معرکوں میں غوث گڈھ کے مقام پر ضابطہ خاں کو زک اٹھانی پڑی۔ حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد ضابطہ خاں نے روہیلوں کی تھوڑی بہت قوت جمع کر لی تھی۔ سودا نے اس واقعہ کی تاریخ یوں کہی ہے :-

کھیت رہنے سے یار و حافظ کے ۔۔۔ قوم افغاں کا رہ گیا تھا بھرم
ضابطہ خاں نے لڑ نجف خاں سے ۔۔۔ نہ رکھا کچھ سپہ گری کا دھرم
تھا تو نتّا دلے نہ دیکھا تھا ۔۔۔ کچھ زمانے کا اپنے سرد اور گرم
شیر میداں سے خاص کر بھاگا ۔۔۔ منڈ کے رو یہ کا اپنے منھ پہ چرم
تب بڑے پیر کی کہی تاریخ ۔۔۔ غوث گڈھ سے گیا وہ کھو کر شرم

کلیات سودا، صفحہ ۲۲۴ - مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۶ء

مگر انجام کار شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ شاہ عالم نے نجف خاں کو علیحدہ کر کے ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۲ء میں ضابطہ خاں کو قلمدانِ وزارت سونپ دیا۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۵ء میں ضابطہ خاں کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا غلام قادر روہیلہ وزیر ہوا۔ مرہٹوں اور روہیلوں کی کشمکش میں بادشاہ اور عوام کا جینا یوں ہی حرام ہو چکا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اسی سال شاہ عالم نے خود کو مرہٹوں کی سپردگی میں دیدیا جو سندھیا کے ماتحت تھے۔ اب انگریزوں نے بھی جن کی دلّی دربار پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت اب تک نہ ہو سکی تھی، شاہ عالم کی پنشن بند کر دی۔ ادھر سندھیا نے شاہ عالم سے پٹیل کا خطاب پایا جو غلام قادر کو ایک آنکھ نہ بھایا، اور وہ مرہٹوں سے جنگ آزما ہوا۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں ادبار و نحوست نے ہر طرف۔ شکنجوں میں جکڑ لیا تو شاہ عالم نے سنبھل کر مرہٹوں کی گرفت سے نکلنے کی بھی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا بلکہ اس کا نتیجہ اُلٹا یہ ہوا کہ اب مرہٹوں کی ایک مستقل فوج دلّی میں رہنے لگی۔ غلام قادر نے جو اپنے اقتدار کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا، مرہٹوں کو رشوت دے کر دلّی سے ہٹا دیا۔ جب راستہ صاف ہو گیا تو حملہ کر کے شاہ عالم کو گرفتار کر لیا۔ اور نہایت سختی سے چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ پوچھا۔ اس کے انکار پر نجیب الدولہ کے اس رذیل فطرت پوتے نے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ یہ واقعہ ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں پیش آیا۔ میر تقی میر نے اسی واقعہ سے متاثر ہو کر کہا ہے ؎

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی ۔۔۔ انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

یہ ایک ایسا المیہ تھا جس نے چار دانگ ہند میں زلزلہ برپا کر دیا۔

غلام قادر نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالنے کے بعد اس سے پوچھا "بول اب تجھے کیا سوجھتا ہے؟" اور شاہ عالم صرف اس قدر جواب دے سکا کہ "مجھے وہ قرآن پاک دکھائی دیتا ہے جو میرے اور تیرے درمیان ہے"۔ اس عبرتناک سانحے پر دوسرے شعراء کے علاوہ اس نے بھی خود اپنا مرثیہ کہا ہے ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما ۔۔۔ داد بر باد سرو برگ جہانداریِ ما
آفتابِ فلک رفعتِ شاہی بودم ۔۔۔ بردر شام زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشم من کند شد از جورِ فلک ابتر شد ۔۔۔ کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش ایں بود ۔۔۔ چیست امید کہ بخشد گنہ گاریِ ما
حق طفلاں کہ زسی سال فراہم کردند ۔۔۔ کردہ تاراج نمو دند وفاداریِ ما [1]

---

[1] شاہ عالم نے تیس برس تک غلام قادر کی پرورش اولاد کی طرح کی تھی۔

عہد و پیمان نہ دادہ و نمودند دغا   مخلیاں خوب نمودند وفاداریٔ ما

شیر دادیم بہ افعی بچۂ پروردیم   عاقبت گشت بجور پئے خونخواریٔ ما

قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی دارند   بسکہ گشتند مجوز بہ گرفتاریٔ ما

ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بہ دوزخ برود   بانیٔ جور و ستم شد بہ دل افگاریٔ ما

اسی مرثیہ میں شاہ عالم نے ان تمام نمک حراموں اور غداروں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بدولت اسے یہ دن دیکھنا پڑا ہے

گل محمد کہ ز مرداں بہ شرارت کم نیست   چہ قدر کرد و کالت پے آزاریٔ ما

نامراد او و سلیماں و بدل بیگ لعیں   ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاریٔ ما

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من   زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریٔ ما

وفاداروں اور بہی خواہوں کا بھی ذکر ہے ؎

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست   ہست مصروف تلافی ستمگاریٔ ما

اور انگریزوں اور آصف الدولہ سے بھی دادرسی کی توقعات وابستہ کی ہیں ؎

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند   چہ عجب گر بنماہند مددگاریٔ ما

راجہ و راؤ، زمیندار امیر و چہ فقیر   حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواریٔ ما

محلات کی طوطا چشمی کا بھی گلہ کیا ہے ؎

نازنیناں پری چہرہ کہ ہمدم بودند   بنیست جز محل مبارک بہ پرستاریٔ ما

آخر میں امید افزا حالات یہ بھی کہلواتے ہیں کہ ؎

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدم   باز فردا دہد ایزد دیہر سرداریٔ ما

بہرحال یہ دردناک مرثیہ ایک شہنشاہ کی بے بسی کا عبرتناک مرقع ہے۔ شاہ عالم، سلیم گڈھ کے قلعہ میں قید تھا۔ اسی اثناء میں سندھیا، مرہٹوں کی فوج لے کر آ گیا۔ غلام قادر محلات میں آگ لگا کر شاہدرہ میں اپنی فوج سے جا ملا۔ میرٹھ میں مرہٹوں اور غلام قادر کی مڈبھیڑ ہوئی۔ غلام قادر بھاگا، لیکن گرفتار ہوا، زباں درازی کی پاداش میں زبان کاٹی گئی۔ گدھے پر سوار کر کے گشت کروایا گیا پھر بڑی اذیت دے کر قتل کیا گیا۔ انشاء نے تاریخ کہی ؎

نطفۂ ابلیس و شے بد سرشت   آنکہ قضا ایش بجہنم رساند

خانۂ تیموریہ برباد داد   زانکہ شہ دا متعہ چیزے نماند

کند لعیں چشم شہنشاہ را   طرفہ کرند بخلافت رساند

سانحہ افگندہ سر خود بہ پیش   فاعتبروا یا اولی الابصار خواند

۱۷۸۹ء

جب دلی پر یہ گزر رہی تھی، شعرائے لکھنؤ زلف و کاکل کے پیچ میں الجھے ہوئے تھے۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں میر حسن کی سحرالبیان ہی منظر عام پر آئی تو اس کا رنگ کچھ یہ تھا ؎

کھولئے شوق سے بند انگیا کے   لیٹ کر ساتھ نہ شرمایئے آپ   (رنگین)

تیرے پستاں پر نظر آتا ہے عالم نور کا   اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا   (مصحفی)

اہل دلی کی معاملہ بندی اقتصادی بدحالی اور آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے اس حد تک کبھی نہ کر سکی، گو اس سانحہ سے

پہلے خود شاہ عالم کا یہ حال تھا ؎

صبح تو جام سے گزرتی ہے — شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہے

آخر کار اس کی شاعری کا رنگ یہ ہو گیا :-

کیجے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا — ہم تو بندے اسکے ہوں وہ یار ہو اغیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اپنے آہ — ہو جیو یارب بھلا اس چشم آتشبار کا
اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب — دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا

"نادرات شاہی" میں اس کا ہندی کلام بھی موجود ہے۔ اُردو دیوان میں مثنوی "منظوم اقدس" یعنی شاہ چین مظفر شاہ کا قصہ بھی ہے اور نثر میں چار جلدوں میں "شاہ عالم کا قصہ" بھی پایا جاتا ہے، لیکن اس کی یہ عجیب خصوصیت ضرور حیران کن ہے کہ اس نے آنکھ کے مضمون کو سو سو رنگ سے باندھا ہے ؎

دلبر سے دل کے آہ ان آنکھوں نے کیا کیا — کی اپنے بت سے چاہ ان آنکھوں نے کیا کیا
کرتی ہیں میرے دل پہ جو کچھ بلا سو آنکھیں — تقصیر نہیں کسو کی جو ہیں بلا سو آنکھیں
مجھ سے سلوک آنکھوں نے کیا کچھ کیا ہے ہائے — دل میرا دام عشق میں پھنسوا دیا ہے ہائے
دلبر سے دل لگایا ان آنکھوں کا برا ہو — جی مفت میں پھنسایا ان آنکھوں کا برا ہو

اس آڑے وقت میں سندھیا نے مغل بادشاہ سے وفاداری کا ثبوت دیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ نے بھی اسے فرزند دلبند کا خطاب دے کر مختار کل بنا دیا۔ بادشاہ نابینا ہونے کے باعث کاروبار سلطنت سے دست کش ہو چکا تھا اور اب تمام قلعے اور شہر میں سندھیا کا طوطی بولنے لگا، لیکن لال قلعہ کی حفاظت کی ذمہ داری کا اعزاز مرہٹوں کی قسمت میں زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا۔

وارن ہیسٹنگز جس نے شاہ عالم کی پنشن بند کی تھی اکثر کہا کرتا کہ کلایو کو اتنا گراں بہا تحفہ دینے کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ یہ اس کی اپنی چیز نہ تھی۔ اب بنگال انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ بادشاہت کے خاتمے کے لئے کڑا اور الہ آباد کے اضلاع بھی شاہ عالم سے لے کر نواب اودھ کو دے دئے گئے۔ ہیسٹنگز جلد از جلد حکومت دہلی کی مرکزیت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ عوام کی بادشاہ پرستی انگریزوں کا سکہ نہ چلنے دے گی۔ اسی مقصد کے تحت نوابان اودھ کو سلطنت دہلی کے خلاف خوب شہ دی جا رہی تھی۔ شاہ عالم نے وارن ہیسٹنگز کو خطاب بھی دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

۱۱۹۹ھ/۱۷۸۹ء میں ہیسٹنگز کے بعد لارڈ کارنوالس نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمانے کے بعد میسور کی طرف توجہ کی اس لئے کہ سلطان دہلی کے مقابلہ میں سلطان ٹیپو کا تدبر اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت انگریزوں کے مستقبل کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھے۔ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں مرہٹوں اور نظام سے جنگ کے بعد سلطنت خداداد کی سرحدیں پونہ اور حیدر آباد تک پہونچ گئی تھیں۔ اندرون ملک شورشیں بھی دبا دی گئی تھیں۔ سلطنت خداداد فروغ پا رہی تھی مگر انگریز بھی غافل نہ تھے اور برابر فوجی طیاریوں اور جوڑ توڑ میں مشغول تھے۔ ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء میں جب ٹیپو، کالی کٹ کی بغاوت فرو کرنے کے بعد راجہ کوچین اور راجہ ٹراونکور کی چالاکیوں کے نتیجہ میں شکست سے دو چار ہوا تو انگریزوں نے اس موقع سے فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور مدراس کے گورنر میڈوز نے اچانک میسور پر حملہ کر دیا۔ لیکن سلطان نے اسے بری طرح پسپا کر دیا اور گورنر جنرل کارنوالس نے اس شکست کا انتقام لینے کے لئے ملک گیر تیاریاں کیں۔ ۱۲۰۳ھ/۱۷۹۰ء میں انگریز، نظام اور مرہٹوں نے ایک معاہدہ کیا کہ ٹیپو کی طاقت کو مٹا کر اس کا ملک آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔

جنوری ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں کارنوالس، مدراس پہونچا اور ایک ماہ کے اندر ہی تمام معاہدوں سے انحراف کرکے اس کی فوجوں نے بغیر اعلان جنگ کئے بنگلور پر قبضہ کرلیا اور دوسری طرف سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نظام اور مرہٹوں نے میسور پر حملہ کردیا۔ نظام کی فوجوں نے کڑپہ اور سرھوٹ پر قبضہ کرلیا۔ مرہٹوں نے پرسرام کی سرکردگی میں دھارواڑ پر اور ہری پنڈت پھڑکیا نے ہرپن پلی پر قبضہ جمایا۔

انگریز، ٹیپو سے اتنے خوفزدہ تھے کہ اتحادی طاقت کے باوجود انھوں نے حملہ سے پہلے کرنل ریڈ کی وساطت سے سلطنت خداداد میں سازشوں کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ اہل مغرب کا یہ وہ حربہ تھا جس سے مشرق ابھی تک ناآشنا تھا۔ بنگلور پر انگریزی قبضہ دراصل کشن راؤ کی نمک حرامی کا نتیجہ تھا۔ اب سرنگا پٹم کا محاصرہ کیا گیا۔ جہاں مہدی خاں نائطہ کی نمک حرامی سے گنجام کے مورچے پر انگریزی قبضہ ہوگیا۔ پھر بھی موسلا دھار بارش، رسد کی کمی اور سلطان کے جوابی حملوں کی تاب نہ لاکر انگریزوں کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ انگریزی فوج اسی وقت تباہ ہوجاتی لیکن اس کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا کہ پرسرام بھاؤ اور ہری پنتھ کے زیر کمان ایک مرہٹہ فوج اس سے آکر مل گئی وافر سامان رسد ان کے ساتھ تھا۔ اب مگڑی اور نندی درگ کے قلعوں پر قبضہ کرکے انگریزوں نے دوبارہ سرنگا پٹم کا محاصرہ کرلیا ادھر حیدر آبادی فوج نے حافظ فریدالدین کے تحت گرم کنڈہ کا محاصرہ کررکھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نظام کی فوج بھی سرنگاپٹم کے محاصرہ میں انگریزوں کی شریک ہوگئی۔ پھر بھی پہلے ہی حملے میں یہ اتحادی فوج بری طرح پسپا ہوئی لیکن شام ہوچکی تھی اس لئے تعاقب نہ کیا گیا۔ یہ ایسی فوجی غلطی تھی جس نے جنگ کا انداز ہی بدل دیا۔ اور ۲۳؍ فروری ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء کو ٹیپو کو انگریزوں سے دب کر صلح کرنی پڑی۔ انگریزی رشوت قصر سلطنت میں رخنے ڈال چکی تھی۔ مجبوراً یہ شرط بھی ماننی پڑی کہ تین کروڑ روپیہ بطور تاوان انگریزوں کو دیا جائے اور جب تک روپیہ ادا نہ ہو دو شہزادے انگریزوں کی حراست میں بطور یرغمال رکھے جائیں۔ مگر جب شہزادے انگریزوں کے قبضہ میں آگئے تو برشت وباہی اس بات کی بھی طالب ہوئی کہ کورگ کو انگریزوں کے حوالے کردیا جائے اور نتیجہ میں تقریباً آدھا ملک سلطان کے قبضہ سے نکل گیا!

۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء میں تاوان ادا ہوا۔ شہزادے واپس آئے۔ قلعوں کی مرمت کی گئی اور سرداروں سے حلف وفاداری لیا گیا۔ بحری اور بری فوج کی از سر نو تنظیم کی گئی۔

۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں اودھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔ کمال الدین حیدر مرتب تاریخ اودھ نے ایک دوہا بھی لکھا ہے ؎

ایک ہزار آٹھ سو سمت کا پرمان، ۱۲ ۱۲ ھ جانت سکل جہان
ربیع الاول ۲۸ اور جمعرات مدوران سری پریوا گوار کی جب آصف تجیو پران

وقتی طور پر لکھنؤ کی رنگ رلیوں پر اوس پڑ گئی۔ تقریباً تمام شعراء نے سوگ منایا اور قطعات تاریخ کہے۔ نمونے کے لئے تاریخ کا قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے:-

الٰہی آصف الدولہ بہادر بحق نائب تو باد مغفور
نوشتم سال تاریخ وفاتش بود با حیدر کرار محشور

۱۲ ۱۲ ھ

(کلیات تاسخ، مطبوعہ نولکشور ۱۹۰۸ء صفحہ ۳۱۲)

اس کے بعد وزیر علی خاں نے قلمدان وزارت سنبھالا۔ سوجھ بوجھ کے آدمی تھے مگر عجلت پسندی سے سیاسی بہتری کے تدارک کی فکر کرنے لگے انگریز ایسے آدمی کو بھلا کیونکر برداشت کرسکتے تھے۔ انھوں نے رقابتوں اور خود غرضیوں کو خوب ہوا دی اور جب نواب ناظر تحسین علی خاں کی درخواست پہونچی تو انگریزوں کو حیلہ ہاتھ آگیا اور انھوں نے اس الزام کے ساتھ کہ وزیر علی، آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں، انھیں تخت سے علیحدہ کرکے درگا کنڈ بنارس میں نظر بند کردیا۔ وزیر علی نے بعد میں راجہ بندیلکھنڈ، ہمت راؤ سے سازش کرکے علم بغاوت بلند کرنا چاہا لیکن راز فاش ہوگیا اور اب انھیں کلکتہ میں نظر بند کردیا گیا۔ جہاں ریذیڈنٹ چیری کی بدتمیزی پر اسے قتل کرکے فرار ہوئے مگر منشی باقر

راجہ جے پور کی عنایتوں سے پھر گرفتار ہو گئے۔ اب قید تنہائی نصیب ہوئی، اسی زمانہ میں یہ اشعار کہے ہیں جن میں انگریزوں کے الزام کا بھی ذکر ہے ؎

جوں سبزہ رندتے رندتے ہی پاؤں کے تلے ہم — اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں — رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے — نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم

قید ہی کے عالم میں ۳۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء میں انتقال کیا۔ بہرحال ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء خاصا پر آشوب سال تھا۔ انگریز ستم ڈھا رہے تھے مگر زندہ دلانِ لکھنؤ وقت کی رفتار سے بے خبر عموماً گل و بلبل کی راگنی ہی الاپ رہے تھے۔ معاملہ بندی ریختی کی طرف رجوع کر رہی تھی اور غزل واردات سے بے نیاز تکلفات کا شکار ہو چکی تھی۔ مسایل حیات کی جگہ نفسیاتی اُلجھنیں شاعری کا مطمعِ نظر بن گئی تھیں، مصنوعی اندازِ بیان مقصدِ فن تھا۔ صناعی اور اختراع کی ساری کوششیں زبان و بیان کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ قریب قریب ہر شاعر اسی انداز پر سوچ رہا تھا ؎

بنت انگیا میں ٹکے زور ترڑاتے کی پھبن — دیکھ کر مارے مزے کے جنھیں جی جائے اُلٹ (انشاء)

خال خال ایسے شعراء بھی تھے جنھوں نے اس انداز پر بھی سوچا کہ ؎

قسمت میں جو لکھا سو وہی ہووے گا امیر — دُنیا کے واسطے تو لجاجت نہ کیجئے
اس دہر خرابات میں رہنے کا نہیں کام — جاتے رہے رفقاء تو اسی راہ گزر سے

(کلیات نواب امیر الامراء - قلمی)

نہ کیجے زعم دولت پر کہاں ہے — سریرِ حشمت و صاحبقرانی
کہاں ہے شوکت تختِ سلیماں — کدھر ہے وہ درخشِ کاویانی ؏

مگر غالباً یہ سب وقتی تاثر کے نتائج تھے ورنہ لعبتانِ فرنگ کے جمال نے عموماً ان کی آنکھیں کچھ اس قدر خیرہ کر دی تھیں کہ فرنگی سیاست کی تباہکاریوں کو نہ دیکھ سکے ؎

چشم کافر دلِ بیمار کی کو صحت بخشا — یہ فرنگی نے مسیحا کا سا اعجاز کیا

لکھنؤ کی دماغ سوز شاعری سے ہٹ کر دکنی پر نظر کیجئے تو وہاں اب بھی دل کی واردات ہی سب کچھ تھی۔ تاہم دونوں جگہ غزل پر سارا زورِ قلم صرف کیا جا رہا تھا۔ دکن میں ابھی تک مثنویوں کا دور تھا۔ مگر اکثریت مذہبی مثنویوں کی تھی عشقیہ مثنویاں بھی عام تھیں تاہم سیاسی ابتری کا ذکر وہاں بھی نہ تھا۔ اور جنوب میں بھی مذہبی اور عشقیہ مثنویاں ہی تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں۔ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء میں مدراس کے مولانا باقر آگاہ کی ہشت گلزار اور خمسۂ متحیرہ میں ان کے نمونے ہیں۔ خمسۂ متحیرہ میں دونوں قسم کی مثنویاں ہیں۔ صبح نو ۱۵۰۰ اشعار پر مبنی ہے مسایل تصوف سے متعلق ہے، زبان بہت صاف ہے جس کا اندازہ ذیل کے شعر سے کیا جا سکتا ہے کہ ؎

مجھے کر نشۂ وحدت سے مسرور — سدا رکھ دردِ توحید سے دور

"نسبتِ عشق" میں "چندر بدن و مہیار" کا قصہ نظم ہوا ہے ؎

عدم تھے جو ظلمت میں بے ما و من — ہوئے نور سے تیرے چندر بدن

"حیرتِ عشق" و "حسرتِ عشق" المیہ مثنویاں ہیں۔ عزیز الدین خاں مستقیم جنگ نامی ارکاٹ کے ایک شاعر کی لیلیٰ مجنوں، شیریں و بلقیس سلیمان وغیرہ مثنویاں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ اظفری بھی اسی زمانے میں دلی سے مدراس آگیا تھا۔ ایسے قادر الکلام شعراء

کی موجودگی میں یہ قرینِ قیاس نہیں کہ سیاسی حالات پر انھوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تاہم ٹیپو کی کوششوں اور انگریزوں، فرانسیسیوں اور مرہٹوں وغیرہ کی چیرہ دستیوں کی منظوم داستانیں شاذ ہی پائی جاتی ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہی ہے کہ انگریزوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں ایسی تمام چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلف کر دیں۔

۱۲۱۲ھ / ۹۸ء لارڈ ویلزلی نے گورنر جنرل ہو کر ہندوستان کے حکمرانوں کا زور توڑنے کے لئے "سب سی ڈیری سسٹم" کا جال بچھایا اور ان کے حلیف بھی اس سے بچ نہ سکے۔ خود نظام حیدر آباد، عظیم الامراء ارسطو جاہ کی غداری سے مجبور ہو گیا کہ انگریزی فوج اپنے یہاں رکھ کر اس کے سارے اخراجات برداشت کرے۔ حیدر آباد کے فرانسیسی ملازمین بھی برخواست کروا دئے گئے، نیز مرہٹوں میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ ابدالی کا پوتا شاہ زماں ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسی طرح مرہٹوں کو نظام کے خلاف اکسایا گیا اور خود مرہٹوں میں پھوٹ ڈالی گئی۔ غرضیکہ دولت راؤ سندھیا شمالی علاقوں کی حفاظت کے لئے پونہ سے گوالیار چلا گیا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے مراد آباد کے ایک شیعہ کو بھیج کر ایران کو افغانستان سے الجھا دیا۔ سلطان ٹیپو جو اندرونِ ہند حکمرانوں کی خود غرضی اور دوں ہمتی کو بھانپ چکا تھا ترکی اور افغانستان سے خط و کتابت کر رہا تھا کہ انگریزوں کا استیصال کر سکے۔ لیکن ان کی ایسی ہی چالوں کی وجہ سے بیرونی امداد سے محروم رہا۔ اس کے علاوہ ویلزلی نے خفیہ خفیہ سلطان کے خاص عمائد میر صادق، میر معین الملک، بدر الزماں خاں نائطہ، میر غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین اور پورنیا کو بھی جن پر سلطان کو بڑا اعتماد تھا، رشوت اور وعدوں کے ذریعے توڑ لیا۔ ذاتی اغراض اور انفرادی مفاد نے ملک و ملت کو فروخت کرنے میں ذرا تامل نہ کیا۔ پورنیا، میسور میں ہندو راج کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ معین الدین اور قمر الدین کو گرم کنڈہ کی ریاست کے خواب دکھائے گئے اور میر صادق کو میسور میں جھنڈا گاڑنے کا سبز باغ دکھایا گیا تھا۔

میر قمر الدین کی غداری سے سرنگاپٹم کے محاصرے میں انگریزوں کو کسی مزاحمت سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ اور ۴ مئی ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء کو پورنیا اور معین الملک کی غداری سے انگریزی فوج قلعہ کے گرد آ گئی۔ سلطان جو دسترخوان پر بیٹھا تھا خبر ملتے ہی باڈی گارڈ کے ساتھ موقعہ پر پہونچا۔ اور دوپہر سے چار بجے تک شمالی فصیل پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہونے دیا۔ لیکن پورنیا نے جنوبی فصیل سے انگریزوں کو قلعہ میں داخل کر لیا۔ میر صادق نے انگریزی فوجوں کی رہنمائی کی۔ غداروں اور دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا ٹیپو دست بدست جنگ کرتا رہا۔ اپنے قریبی لوگ بھی غدار ہو چکے تھے کہ سخت پیاس کے باوجود ٹیپو کے خاص غلام نے پانی کی چھاگل دینے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ خود کو گرفتار کروا دے لیکن ٹیپو نے یہی جواب دیا کہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"۔

آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا　　جس سے قایم ہوئیں آئینِ حمیت کی حدود
شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی　　یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ غلود؟　　(ظفر علی خاں)

آخر اسی روز مغرب کے وقت ملک و ملت کے آبرو باختہ افراد کے طفیل خود انھیں کی بہبود کے لئے شیرانہ جنگ کرتا ہوا شہید ہو گیا۔

اسی دور کا ایک نامعلوم شاعر ان واقعات کو یوں نظم کرتا ہے ؎

تھا میر صادق لعنتی اعرا یزید نابکار　　سونپا تھا شہ اس کے تئیں قلعہ کا سب اختیار
کر کے فتور، او بدبخت کتیا فرنگی سے قرار　　مردود نے کر اقرار پہ پٹن کو گھیرا نابکار　　(سرنگاپٹم)
.... پھر سلیمانی کہاں
ابر ہندا بی آن کر پٹن کو گھیرا ایک بار　　میر صادق نے کہا اس کو اتر ندی کے پار
شہ نے جب بولا کرو قلعہ کے تئیں تم استوار　　فوج کو اپنی بلا شہ نے کہا ہے وقت کار
پاؤ گے درجہ شہادت حق سے در ہر دو جہاں

کرنل بٹسن کے مطابق جو اس جنگ میں شریک تھا۔ ۴ تاریخ کی صبح کو مسلمان اور برہمن نجومیوں نے سلطان سے آکر کہا کہ آج کا دن

سلطان کے لئے منحوس ہے۔

تاریخ تھا انیسویں ذیعقدہ روز ہفت تھا   تعویم کے احوال پر آ کر منجم نے کہا
تقدیر کی تحریر پر راضی ہوں بولا بادشاہ   از برائے دینِ احمد جانِ خود سازم فدا
ذلتِ اسلام نا ہوئے الٰہی در جہاں
دو پہر کا وقت تھا غوغا کئے کافر تمام   چھوٹے سلخ توپوں کے اکرم نہ رہا کوئی سقف و بام
میر صادق لعنتی کا جس طرف تھا اہتمام   کر دیا ہلا فرنگی اس طرف سیتی تمام
تاب نا لا بھاگ نکلا لعنتی ولد زناں
الغرض ضرب تفنگ از گوش تھا گوشِ جگر   دوسرے شنبہ مبارک ہو رکھا خونِ جگر
دینِ شہ سیتی ہوا اللہ اللہ نگر   روح اعلا پر کیا پرواز ہر شمس و قمر
آواز پر آواز تھا کلمہ شہادت برزباں

یہ وہ مقتدر ہستی تھی جس کا ثانی ہندوستان پھر کبھی نہ پیدا کر سکا۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں اس کی سبق آموز وطن پرستی نے حریت پسند شعور کو ہمیشہ چونکایا گیا۔ اور صدہا نظمیں آزادی کے اس علمبردار کو خراج عقیدت پیش کرتی رہیں۔ دورِ حاضر میں درج ذیل اشعار اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

آں شہیدانِ محبت را امام   آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر   خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین   فقر سلطاں وارثِ جذبِ حسین
رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز   نوبت او در دکن باقی ہنوز   (اقبال)
ہند کی قسمت ہی میں رسوائی کا ساماں تھا   ورنہ تو تمہید آزادی کا اک عنوان تھا
مصر سے تا روم پہونچی تیری آواز بلند   گونج اس کی آج بھی باقی ہے با انداز چند
ہند میں جو چاہتا تھا ہندیوں کی برتری   خودشناسی اور خودداری تھی جس کی خودسری   (سیماب)
وہ بادہ جس کا کہ خوانِ شہید تھا شیدا   وہ نوش جس کو کہ تغلق نے تھا پسند کیا
وہ زہر جس کا کہ ہیوں نے پی لیا پیالہ   ازل کے دن سے وہ حصہ نصیب ٹیپو تھا
مراد وہ موت جسے کہئے عاشقانہ موت
سپاہی کہتے ہیں اس کو سپاہیانہ موت   (محمود شرانی)

مگر جب بھی ٹیپو کا ذکر آتا ہے غداروں کی نمک حرامی ہمارے لئے ایک لمحۂ فکر ضرور عطا کرتی ہے۔

کشورِ ہند کا رنگ اور ہی کچھ ہوتا آج   مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخ کبود   (ظفر علی خاں)
آہ خود اس کے وطن نے اس سے کیں غداریاں   یاد ہیں وہ ذہن قومیت کی سازش کاریاں   (سیماب)
وہ تو کہئے کہ اپنے ہی پرائے ہو گئے   مٹ گیا تھا ورنہ سطحِ ہند سے نقش فرنگ   (ماہر القادری)

اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن،   ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد،   ملتے از کارشاں اندر فساد

ملک و دینش از مقام خود فتاد   ملتے کو بند ہر ملت کشاد، (اقبال)

دشمن بھی ٹیپو کی عظمت کے معترف تھے۔ اس کی موت دراصل ہندوستان کی آزادی کی موت تھی۔ جنرل ہارس اس کی لاش دیکھ کر فرطِ مسرت سے چیخ اُٹھا۔ "آج ہندوستان ہمارا ہے" اور یہ بات غلط نہ تھی اس لئے کہ ٹیپو کی شہادت کے بعد ہی انگریزی تسلط "دو علی حکومت" کی شکل میں پورے ہندوستان پر چھا گیا۔ ملت فروش غدار اور ان کے طفیل کا ہراول دستہ جنوبی ہند قدرت کے عبرتناک انتقام کا شکار ہوئے۔

سرنگاپٹم کے ایک یہ بھی دن تھے کہ ؎

ندیدہ کس چنیں آب و ہوائے	بدیں خوبی ہمہ نانیست جائے
زباں در وصف آں فرخند کشور	بود لال و کند خامہ نگوں سر
دکن زیں او شدہ دار الخلافہ،	کہ مصئوں باد از ہر آسیب و آفت

لیکن انگریزوں نے ایسا تباہ کیا کہ ۵ لاکھ مسلمانوں کا یہ شہر آج چند سو مسلمانوں کا مسکن ہے، عوام کی اقتصادی خوشحالی کی نعش پر انگریزوں کے ایوان ہائے اقتدار تعمیر ہوتے رہے۔ اور دو چار برس کے اندر ہی لوگ دانے دانے کو محتاج کر دئے گئے۔ میسو کے علاوہ ارکاٹ وغیرہ کا بھی یہی حشر ہوا۔ عمدۃ الامراء غلام حسین خاں والی ارکاٹ کی تعریف میں اس کے درباری شاعر نامی نے تو یہ لکھا ہے کہ ؎

سب فرنگی روبرو اس کے ذرا	کر نہیں سکتے ہیں کچھ چون و چرا

مگر خود عمدۃ الامراء نے نظام علی خاں آصف جاہ کو تحائف کے ساتھ جو نظم بھجوائی تھی اس میں اپنی بے بسی کا اشارہ کیا ہے

ہماری کچھ نہ پوچھو یارو تم بات	ہمارا ملک ہے انگریز کے ہات
ہمیں ہر روز آبا کڑ کڑ ہے	ہماری زندگانی پر تھڑو ہے

اسی نظم میں وہ حیدرآباد کی رونق کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس لئے کہ ابھی انگریزوں نے حیدرآباد کی طرف نظر نہ کی تھی ؎

چل اے دل دیکھ آئیں حیدرآباد	جہاں کہتے ہیں عشرت کی ہے بنیاد
جہاں دارین کا نقش نگیں ہے	جہاں اسلام کا آئینِ دیں ہے
جہاں رکتا ہے تختِ سرفرازی	نظام الدولہ آصف جاہ غازی

بہرحال ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں جنوبی ہند سے فراغت کے بعد انگریزوں نے اپنی ساری توجہ شمالی ہند کی طرف مبذول کی۔ اور حسب جنوبی ہند کے مرہٹوں اور مسلمانوں کو اپنی "ڈپلومیسی" یا مکاریوں سے اس طرح اُلجھا دیا کہ وہ شمالی ہند کے معاملات میں دخل کی فرصت ہی نہ پا سکیں۔ دولت خداداد کے وہ اضلاع جو حیدرآباد کے حصے کے تھے وہ اپنی تحویل میں لے لئے۔ تنجور، سورت اور ارکاٹ جیسی چھوٹی موٹی ریاستوں پر مختلف بہانوں اور طریقوں سے قبضہ کیا۔ اودھ میں وزیر علی خاں کو معزول کرنے کے بعد ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء ہی میں سعادت علی خاں کو مسند وزارت سونپ دی گئی تھی۔ لیکن اس خوشی میں ایک عہد نامے کے ذریعے الٰہ آباد کا قلعہ غصب کر لیا اور لاکھوں روپیہ سالانہ معاوضہ میں مزید اضافہ کروا لئے۔

ناسخ نے تاریخ جلوس یوں کہی ہے :-

خداوندا یمین الدولہ در دہر	حکومت را صدوسی سال باشد
خرد سال جلوس مسندش گفت	بجاہ و حشمت و اقبال باشد

۱۲۱۲ھ

انشاؔ نے قطعہ تہنیت لکھا ہے ؎

سعادتے کہ علی داد نام پاکش را   حصول ایں ہمہ باشد بشہریار محال
یمین دولہ بہادر کہ ناظم الملک است   جناب عالی فرخ شیم استقلال
جلوس کردہ امسال وسال حال الحال   فزوں دوازدہ است از دوازدہ صد سال
مد دائمہ اثنا عشر نمود ندت   خوشا سعادت طالع زہے ہمایوں فال

اسی موقع پر انشاؔ کا وہ شاہکار قصیدہ جس کے آخر میں مختلف زبانوں کے مصرعے ہیں۔ اسی قصیدہ کے آخر میں دعائیہ کے اشعار لکھنؤ کے کارخانۂ نشاط کی غمازی کرتے ہیں:-

تیرے ہی ہجر میں گایا کریں سب اہلِ نشاط   قول و آہنگ و دھوا، ماٹھا، ترانہ، سرگم
بھیرویں گن کلی اور مالسری اور سارنگ   پوربی، گوری، یمن، برج ہیں اور ہتینے فغم
سامنے تیرے ہی ہر وقت رہے اُن کی صدا   تانیں لہراتی رہیں ایسی ہی جوں موجۂ یم
راجہ اندر کے اکھاڑے میں ہو جوں پریوں کا ناچ   درِ دولت پہ رہے یونہی ہمیشہ چھم چھم

لیکن خود سعادت علی خاں نے عوام کے رجحان کے برعکس اس 'چھم چھم' کی طرف زیادہ التفات نہ کیا بلکہ اس ادھیڑبن میں مشغول ہو گیا کہ کسی طرح روپیہ اکٹھا کر کے انگریزوں کا قرض ادا کر دے تاکہ ان کی گرفت سے نکل سکے اور اپنے علاقے واپس لے۔ انگریز ایسے بیدار مغز شخص کو بھلا کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں اسے دبا کر انگریزوں نے ایک اور معاہدہ کیا جس کی رو سے وہ تمام علاقے جو انگریزی فوجوں کی مدد سے حکومت اودھ کے ہاتھ آئے تھے نکل گئے۔ (پھر بھی سعادت علی خاں اپنی کوششوں میں لگا رہا، لیکن قبل اس کے کہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں خود انتقال کر گیا)۔
ناسخؔ نے تاریخ کہی ؎

افسوس کہ نواب یمین الدولہ   از ملک مفارقت بحکم تقدیر
تاریخ وفات او نوشتم ناسخ   'افسوس وزیر بود آصف تدبیر'

۱۲۲۹ھ

۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء میں انگریزی سازشوں کے نتیجے میں ہلکر اور سندھیا میں حصول اقتدار کی زور آزمائی شروع ہوئی۔ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۲ء میں باجی راؤ ثانی کو انگریزوں سے مدد دے۔ معاہدہ بسین اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر سندھیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ کو جنرل لیک کی سرکردگی میں ان مرہٹوں پر حملہ کیا گیا جو دلّی میں موجود تھے اور مرہٹوں کے آپس کے نفاق کی برکت سے ۱۴ ستمبر کو انگریز فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے دلّی میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے سندھیا کو ملا کر ناگپور کے بھونسلا کو غلام بنایا گیا تھا۔ بہرحال دسمبر ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ میں سرجی ارجن گاؤں کے معاہدے پر سندھیا سے دستخط لئے گئے جس کی رو سے اسے دوآب کا سارا علاقہ بشمول آگرہ و دہلی انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ جنرل لیک کو شاہ عالم کی جانب سے 'صمصام الدولہ، اشجع الملک، جنرل دوراں جنرل لیک بہادر فتح جنگ' کے خطابات عطا کئے گئے۔ خلعت و انعام سے بھی نوازا گیا۔ شاہ عالم، مرہٹوں کی گرفت سے نکلا بھی تو اس لئے کہ انگریزوں کا طوق غلامی پہن لیا۔ بہرحال مسٹر کرنل اکٹرلونی کمپنی کے ڈپٹی ایڈ جوئنٹ جنرل دلّی کے ریذیڈنٹ ہوئے۔ بادشاہ کا سکہ چلتا رہا لیکن اسے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ

سالانہ پنشن دے کر امور ملکی سے بیدخل کردیا گیا۔ سندھیا سے فراغت کے بعد اندور کے مرہٹہ راجہ جسونت راؤ ہلکر کی طرف توجہ دی گئی۔ ولزلی نے سب سڈی ایری سسٹم، کا جال پھینکا لیکن وہ فریب میں نہ آیا تو ۱۸۰۴ء ۱۲۱۹ھ میں اس پر حملہ کردیا گیا۔ امیر خاں روہیلہ اور چند چھوٹی جاٹ ریاستیں ہلکر کے ساتھ تھیں انھوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ اور اگست ۱۸۰۴ء ۱۲۱۹ھ میں انگریزی فوج کے پرخچے اڑا دئے۔ ہلکر کی فوجیں دوآبہ تک بڑھ گئیں، مگر جنرل لیک کی چالاکی اور انگریزی توپخانہ کی آتش فشانی کی وجہ سے گڑھیوں میں محصور ہوگئیں۔ آخر نومبر ۱۸۰۴ء ۱۲۱۹ھ جنرل لیک نے ڈیگ کا قلعہ فتح کرلیا۔ اب انگریزوں نے مرہٹوں اور جاٹوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور ڈیگ کی فتح کے بعد اس مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ انشا نے اپنی ایک غزل میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

مروڑی فوج انگریزی نے دی اک ایسی بے بل سے   کہ رستی کٹ گئی ہولکر کی ٹوٹا جاٹ کا جوڑا

اسی زمانہ میں یورپ میں نپولین نے انگریزوں کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ ولزلی کی تشدد پسند پالیسی نے انھیں اور مسایل میں الجھا دیا اور، ولزلی کو معزول کرکے کارنوالس کو دوبارہ بھیجا گیا تاکہ کسی طرح مرہٹوں سے صلح کرلے۔ مگر ہندوستان پہونچنے کے کچھ ہی دن بعد ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں وہ مرگیا۔ اس کے جانشین بارلو نے ہلکر اور سندھیا سے دب کر صلح کرلی۔ ۱۸۰۶ء ۱۲۲۱ھ میں اندھے بادشاہ شاہ عالم بھی انتقال ہوگیا۔

اور تاریخ کے مطابق ؎

ختم شد سلطنت حضرت تیمور امروز   کرد ملک عدم آباد و شہ کشور ہند
سال تاریخ پئے رحلت شاہ عالم   گفت دل نیر زمیں بود فرخندہ ہند

۱۲۲۱ھ

"افسانہ از افسانہ....."

(ولے برنڈش)

(ع-ر)

ایک انگریز انشا پرداز کا قول ہے کہ "کہانیاں شروع نہیں ہوتیں بلکہ پودوں کی طرح اُگتی ہیں۔"

اسی طرح سعید حسن کی کہانی اُس وقت شروع ہوئی جب وہ اپنے والد اور والدہ کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا کہ خادمہ نے آکر کہا:۔

"چھوٹے میاں دروازے پر ایک آدمی آپ کو بلاتا ہے۔"

سعید حسن نے پوچھا "کون ہے؟"۔

خادمہ نے جواب دیا۔ "فقیر سا معلوم ہوتا ہے اور نام نہیں بتاتا، آپ سے ملنا چاہتا ہے"۔

سعید حسن نے خادمہ سے کہا "پوچھو تو سہی کیا چاہتا ہے"۔

خادمہ نے دروازے پر جاکر تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا: "وہ کہتے ہیں کیا کام ہے؟"۔

اس آدمی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت ٹوکری تھی جس کے ڈھکنے پر پیازی رنگ کا فیتا بندھا ہوا تھا۔ وہ ٹوکری کو اُٹھا کر اپنے منہ کے قریب لے آیا اور اس کے چھیدوں میں سے دیکھ کر کہنے لگا کہ "بلی ہے"۔

خادمہ نے پوچھا "سعید میاں کے لئے؟ کس نے بھیجی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں، سامنے سڑک پر سے ایک بند گاڑی جا رہی تھی ایک دایا نے دروازہ کھول کر مجھے بلایا۔ ایک چونّی دی اور اس مکان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ ٹوکری سعید حسن صاحب کو جو اس مکان میں رہتے ہیں دے آؤ"۔

خادمہ نے کہا:۔ "اچھا تو ٹھہرو میں انھیں بلاتی ہوں"۔ اور کھانے کے کمرے میں جاکر کہنے لگی:۔ "چھوٹے میاں وہ کہتا ہے کہ آپ کے لئے کسی نے بلی بھیجی ہے"۔

سعید حسن نے حیران ہوکر کہا "بلی! میں نے تو کوئی بلی نہیں منگائی تھی"۔

خادمہ نے جواب دیا:۔ "نہیں صاحب وہ کہتا ہے کہ ایک زنانہ گاڑی میں سے کسی نے اُسے پیسے دے کر بلی آپ کو پہونچانے کے لئے بھیجا ہے"۔

سعید حسن کی والدہ مسکرائی "خوب!" اور سعید حسن کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں۔

اس کی والدہ نے خادمہ سے کہا "بلی کو اندر لے آؤ"۔

سعید حسن نے بھی دبی زبان سے کہا "اس آدمی سے کہنا کہ ٹھہرے"۔ اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی عورت یا لڑکی اُسے بلی یا کوئی اور تحفہ بھیج سکتی تھی، کیونکہ وہ ان کے احاطۂ اثر سے ابھی کوسوں دور تھا۔

خادمہ ٹوکری اندر لے آئی اور اس میں سے ایک ہلکی باریک غم زدہ سی "میاؤں" کی آواز آئی۔ سعید حسن نے اٹھکر ٹوکری لے لی اور اسے میز پر رکھ کر کھول دیا، ایک بڑی بڑی آنکھوں والا چھوٹا سا ایرانی بلی کا سفید بچہ نکل کر باہر آگیا، جو بمشکل ایک

مہینے کا ہوگا۔ جہاں تک سعید حسن کو بلیوں کے متعلق واقفیت تھی وہ کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ نہایت اچھی نسل کا تھا۔

سعید حسن کی والدہ نے کہا "اسے دودھ پلائیں"، اور ایک پرچ میں دودھ ڈال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ سعید حسن نے کمرے سے باہر آکر اس آدمی سے پوچھا:۔

"یہ بلی کا بچہ تمھیں کس نے دیا تھا؟"

"ایک زنانہ بند گاڑی وہاں کھڑی تھی"۔ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں سے ایک نرس نے سر نکال کر مجھے بلایا اور یہ ٹوکری دے کر مجھ سے کہا کہ آپ کو پہونچا دوں جب میں نے آکر آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو گاڑی چلی گئی۔

سعید حسن نے پوچھا "نرس؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "ہاں، ہاں نرس، جو اسپتال کی وردی پہنے ہوئے تھی۔ گاڑی میں کوئی اور بھی تھا، غالباً پردہ دار عورت ہوگی، کیونکہ وہ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کرتی تھیں، اور نرس نے بہت تھوڑا دروازہ کھول کر مجھ سے گفتگو کی تھی"۔

"تو لو، یہ تمھارا انعام ہے"۔ سعید حسن نے ایک اور چونی اسے دیدی، اور جب وہ چلا گیا تو کھانے کے کمرے کی طرف واپس آیا۔ آتے ہی اس کی والدہ نے کہا:۔

"ٹوکری میں کچھ اور بھی تھا سعید"۔

"کیا؟"

اس کی والدہ نے ایک سادہ کارڈ اس کے ہاتھ میں دیدیا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"اس نوجوان کے لئے جسے بلیوں سے پیار ہے"۔

"لانے والے سے کچھ پتہ چلا؟" اس کے ابا نے پوچھا:۔

"کیا اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟"

"نہیں"۔

سعید حسن کہنے لگا "اس بچے کا نام عطیہ ہونا چاہئے کیونکہ ہے بھی تو عطیہ ہی"۔

وہ ایک تیئیس سالہ نوجوان تھا نہ بہت حسین اور نہ بدصورت بلکہ جس طرح صحیح و توانا اوسط درجے کے نوجوان ہوا کرتے ہیں وہ بھی تھا، گریجویٹ ہوجانے پر بھی کالج کی زندگی اس کے اطوار کو بگاڑ دینے میں کامیاب ثابت نہ ہوئی تھی اور چونکہ وہ ولایت نہیں گیا تھا اس لئے جنس لطیف سے زیادہ سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اب بھی جب کبھی اس کے والدین اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑتے تو اس کی پیشانی عرق آلود ہوجاتی اور وہ آنکھیں نیچی کرکے کہا کرتا "فی الحال اس کی کیا ضرورت ہے"۔

ایک بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ اسے پالتو جانوروں خصوصاً بلیوں سے بہت انس تھا۔ جب کبھی بازار میں کچھ خریدنے جاتا اور وہاں کسی دوکان پر بلی پلی ہوئی نظر آتی تو سب کام بھول کر وہ اسے گود میں لے لیتا اور پیار کرنے لگ جاتا، راستہ میں چار پانچ بلیوں سے اس نے دوستانہ تعلقات پیدا کر رکھے تھے اس لئے روز دفتر جاتے وقت ایک دو منٹ ہر ایک کے پاس ٹھہر کر اسے پیار کرتا اور اس کے کان میں میٹھی میٹھی باتیں کہتا۔ کبھی کبھی ان کے لئے گھر سے کوئی لذیذ چیز جیب میں ڈال کر لے جایا کرتا۔ اور وہ بھی اپنے مکان کے احاطہ کی دیوار یا پھاٹک کے سامنے چشم براہ رہتیں کہ ابھی ہمارا چاہنے والا اس راستے سے گزرے گا۔

عطیہ نے دودھ ختم کرکے سب کی طرف دیکھا۔ پھر سعید کی طرف آئی اور اس کے شانے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کون ہوگا جس نے اسے تحفہ بھیجا تھا، محبت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا لیکن اس وقت اس کے دل میں ایک بےچینی سی محسوس ہو رہی تھی، اسے خیال آرہا تھا، اس کے چہرے پہ ہلکی سی سرخی نمودار ہوگئی

اسی طرح دن گزرتے گئے اور گھر کے افراد بھول گئے کہ عطیہ کس طرح ان کے پاس آئی تھی، لیکن سعید نہیں بھولا، اکثر جب وہ تھکا ماندہ دفتر سے گھر آتا اور عطیہ کسی مکھی کے تعاقب میں

بھاگتی، یا اپنی دم پکڑنے کی کوشش میں اپنے گرد گھومنے لگتی یا جب وہ گود میں اچھل کر آ بیٹھتی اور غرغر کرنے لگتی تو وہ اس سے پوچھا کرتا "عطیہ تو کس کا عطیہ ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

وہ خیالی حسینہ اس کے دماغ میں سیکڑوں شکلیں اختیار کرتی اور کبھی کبھی خواب میں بھی آ جاتی لیکن جب عطیہ کو آئے ہوئے دو مہینے گزر گئے تو بتدریج وہ تصویر مدھم ہونا شروع ہو گئی، تاہم وہ بدستور دفتر کے راستے میں بلیوں سے ملتا رہتا تھا۔

ان میں سے ایک بلا عطیہ کا رشتہ دار بھی تھا، جو اپنے لمبے لمبے ناخنوں، سیاہ بالوں کو سنوار کر اور بڑی بڑی زرد آنکھوں سے "چشم بہ انتظار" دیوار پر بیٹھا رہتا اور جب سعید آتا تو اپنی پشت کو محراب کی طرح بنائے ہوئے غرا کر اس سے اپنے حسن کی داد لیا کرتا۔

سعید نے اس کا نام سہراب رکھا تھا اور جب وہ اپنی نذر تحسین پیش کر کے دفتر کی طرف چلا جاتا ....

..... تو اس کی "مالکہ" اسے جلا کر اُن بالوں میں جنھیں سعید کے مضبوط ہاتھوں نے چھوا تھا، اپنا خوبصورت لیکن زرد چہرہ چھپا لیا کرتی۔

ایک مہینہ اور گزر گیا اور عطیہ میں وہ شاہانہ وقار پیدا ہونا شروع ہو گیا جو اسے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا تھا۔ سعید مکان میں اکیلا تھا کیونکہ اس کے والدین پہاڑ پر گئے ہوئے تھے ایک ناول جس میں بقول ایک مصنف کے "حسن و عشق کی نیرنگیاں" دکھائی گئی تھیں، فرش پر پڑا تھا اور سعید سوچ رہا تھا کہ کیوں بعض لوگوں کو زندگی میں عجیب و غریب واقعات کا سامنا ہوتا ہے اور دوسروں کو باوجود خواہش کے کوئی واقعہ پیش نہیں آتا وہ بھول گیا تھا کہ عطیہ کا آنا ایک عجیب واقعہ تھا اور اگر اس کے بھیجنے والے کی تلاش کی جاتی تو ممکن تھا کہ عجیب تر ثابت ہوتا۔

لیکن شاید یہ بھی ہو کہ عجیب واقعات تلاش کرنے سے نہیں ملتے۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ عطیہ اچھل کر میز پر جہاں گھنٹی بج رہی تھی جا بیٹھی، سعید حسن نے جمائی لی اور آلہ کو اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

اس آلہ پر جسے لوگ بغیر کسی قسم کے احساس کے بے پروائی سے استعمال کرتے ہیں، عام طور پر آوازیں کرخت اور بے سری معلوم ہوتی ہیں ....

..... لیکن بعض آوازیں دلی جذبات کی کیفیتوں سے پر ہوتی ہیں۔ یہ آواز اسی دوسری قسم کی تھی۔

آواز نے پوچھا۔ "کیا آپ سعید حسن ہیں؟"

"ہاں" سعید حسن نے جواب دیا "آپ کون ہیں؟"

"صبر کیجئے صاحب" آواز نے کہا "پیشتر اس سے کہ میں آپ کو اس کا جواب دوں، آپ یہ بتائیں کہ کسی ضروری کام میں مشغول تو نہیں ہیں اور کیا آپ کے پاس ایک روح سے گفتگو کرنے کے لئے وقت ہے؟"

اسے احساس ہوا کہ یہ کسی عجیب واقعہ کا آغاز ہے اس لئے وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا، اور ٹیلیفون کے آلہ کو منہ کے قریب رکھ کر بولا "نہیں مجھے بالکل فراغت ہے — تاہم — بہانے بنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں تو میں کہنا شروع کروں، کیا آپ بیٹھ گئے ہیں؟"

سعید نے کہا "ہاں بیٹھ گیا ہوں۔ اب بتائیے کہ آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا بات کرنا ہے؟"

آواز نے کہا "میں — میں ایک لڑکی ہوں۔"

"یہ تو مجھے آپ کی آواز بتا رہی ہے۔"

"غالباً ناخوش آیند تو نہ ہو گی؟ — اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ شریف اور بالکل قابل اعتماد ہیں؟"

سعید حسن نے کہا "غالباً ہوں تو سہی۔"

"اچھا تو شریف اور قابل اعتماد صاحب کیا آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گے؟"

سعید حسن نے پوچھا "کیسا وعدہ؟"

"آپ دور اندیش بھی ہیں؟ خوب! لیکن میں آپ سے کسی کام کے کرنے کا وعدہ نہیں چاہتی۔ میں صرف یہ وعدہ چاہتی ہوں کہ آپ کچھ نہ کریں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"تو آپ "باست" کی قسم کھائیے کہ آپ یہ دریافت کرنے کی کوشش نہ کریں گے کہ میں کون ہوں۔"

سعید حسن نے حیران ہو کر پوچھا "باست کون؟"

"بیو باستس۔ مصری پتھاہ کی بیوی، بلیوں کی دیوی! کیا اس کی قسم کھاتے ہو؟"

سعید حسن نے کہا "ہاں، قسم کھاتا ہوں۔ لیکن۔ مجھے دریافت کرنے کا اشتیاق ضرور ہے۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کو اشتیاق ہے، لیکن قسم کھانے کے بعد آپ اپنے وعدے سے پھر نہیں سکتے۔ کیونکہ اگر آپ نے قسم کو توڑ دیا تو تمام شہر کی بلیاں جمع ہو کر آپ کو نوچ لیں گی۔ کیا اس خیال سے آپ کو خوف نہیں آتا؟"

سعید حسن نے کہا "بے شک خوف آتا ہے۔ لیکن کیا یہ پوچھنا بھی ناجایز ہوگا کہ آپ کو کیونکر علم ہے کہ اس دیوی کا نام مجھ پر موثر ثابت ہوگا؟"

آواز نے پوچھا "تو کیا آپ وہ نوجوان نہیں ہیں جسے بلیوں سے پیار ہے؟"

"تو کیا عطیہ کے لئے مجھے آپ کا ممنون ہونا چاہئے؟"

"خوب، اے بیو باستس کے پرستار! آپ کو بلیوں کا نام رکھنا خوب آتا ہے۔ کیا عطیہ خوبصورت ہے؟"

سعید حسن نے جواب دیا "اب تو وہ اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے۔ وہ ہماری باتیں سن رہی ہے اور نہایت سمجھدار و عقلمند ہے"

آواز نے کہا "میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو پسند ہے۔ لیکن اب مجھے آپ کا قیمتی وقت ضایع نہیں کرنا چاہئے، میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن نہیں کہہ سکتی۔"

"تو کہہ ڈالئے نا۔"

"جب کبھی رات کے وقت میری طبیعت چاہے کیا میں آپ سے باتیں کر لیا کروں؟"

سعید حسن نے کہا "بڑی خوشی سے۔"

"میں زیادہ مدت تک آپ کی سمع خراشی نہیں کروں گی، اب غالباً بہت تھوڑا زمانہ باقی ہے، پھر میں چلی جاؤں گی۔"

آواز میں غمگینی کی جھلک تھی۔

اس نے پوچھا "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اس نے جواب دیا "مجھے خود علم نہیں۔"

سعید حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ خوش تھا کہ کسی نے دیکھا نہیں۔

"مجھے معلوم نہیں۔ لیکن بعض وقت انسان کا دل کسی سے بات کرنے کو خواہ مخواہ چاہتا ہے۔ اے مہربان آواز کیا آپ اکیلی ہیں؟"

مہربان آواز نے غمزدہ لہجہ میں جواب دیا "بے شک، سوا آپ کے میں بالکل تنہا ہوں۔ ورنہ آپ سے باتیں کس طرح کر سکتی۔ آپ براہ عنایت کسی سے نہ کہیں کہ میں آپ سے باتیں کیا کرتی ہوں۔ یہ ہمارا باہمی راز ہے۔"

سعید حسن نے کہا "میں کسی سے نہ کہوں گا۔ تاہم آپ کو مجھ سے باتیں کرنے کی کیوں خواہش ہے، کیا ہم نے ایک دوسرے کو کہیں دیکھا ہے؟"

اس کے کان میں ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی "کیا معلوم؟ شاید صدیاں گزریں بیو باستس کے مندر میں دیکھا ہوگا۔ لیکن کیا میرا آپ سے باتیں کرنے کا خیال عجیب نہیں ہے۔ کسی وقت بعض لوگ تنہائی سے اس قدر گھبرا جاتے ہیں کہ اگر یہ آواز گفتگو ان کی مدد کرے تو کوئی عیب کی بات نہیں۔ کیا آپ نے اس لڑکی کی کہانی سنی ہے جس نے تنہائی سے عاجز ہو کر ایک شخص کو

جسے وہ چاہتی تھی کئی محبت نامے لکھے لیکن اسے یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ وہ کون ہے جب تک کہ اس جہان سے سفر نہ کر گئی۔"

"میں نے نہیں سنی۔" سعید حسن نے کہا۔ "لیکن کیا آپ تنہائی سے عاجز ہیں؟"

"بے شک"

"تو آپ کو میرا ہی خیال کیوں آیا؟"

"یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی، اگر آپ خود نہیں سمجھ سکتے۔"

اس کے بعد ٹیلیفون کا تعلق علٰحدہ کر لیا گیا اور سعید حسن گویا کسی نہایت دل خوش کن خواب کے درمیان بیدار ہو گیا۔

رات کے نو بجے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ سعید حسن کا تمام دن ایک عجیب قسم کی بے قراری میں گزرا تھا، شام کا کھانا کھا کر وہ نشست کے کمرے میں ٹیلیفون کے پاس ایک ناول ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا تھا، اور گو اس واقعہ کو ایک گھنٹہ سے زاید عرصہ گزر چکا تھا، کتاب کا وہی صفحہ اس کے پیش نظر تھا، وہ اسے بار بار شروع سے اخیر تک پڑھ جاتا تھا، لیکن چونکہ اس کے دماغ میں ناول کے واقعات کے ساتھ بلیاں اور ٹیلیفون کی گھنٹیاں اور نرم و نازک غمگین سی آواز کے ساتھ کسی خیالی حسینہ کی سیکڑوں مختلف تصاویر بکھر رہی تھیں، ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

وہ گھنٹی کی آواز سے چونکا، اور ٹیلیفون کی طرف جھپٹا۔ آلہ کو کان سے لگانے پر اسی میٹھی میٹھی آواز نے یہ سوال کیا۔

"کیا آپ خود ہی ہیں؟"

"بیشک میں ہی ہوں۔"

"آپ کیا کر رہے تھے؟"

"انتظار"

"کس کا؟"

"آپ جانتی ہیں کس کا"

"خوب! آپ کیا جانیں کہ میں کون ہوں، آپ کے پڑوس کے مکان میں ہوں یا دو میل کے فاصلہ پر، خوبصورت ہوں، یا بدصورت، نار گھر کی ملازمہ ہوں یا کسی شاندار محل میں رہنے والی مالدار دوشیزہ۔ کسی کے گھر کی نوعمر خادمہ ہوں یا کوئی ستر سالہ کنواری خاتون، غرض یہ کہ آپ کو کیونکر علم ہے کہ میں کون ہوں؟"

سعید حسن نے کہا "آپ جو کچھ ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ بہت عجیب ہیں۔"

آواز نے جواب دیا "ہاں میں بے حد عجیب ہوں اور بہت حسین بھی، میں آپ کا دل چرالوں گی اور ہر روز رات کے وقت آپ سے گفتگو کیا کروں گی۔"

سعید نے پوچھا "آپ کون ہیں، خدا کے لئے بتائیے کیا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"ممکن بھی ہے اور غیر ممکن بھی۔ میں نے تو آپ کو ضرور دیکھا ہے، کم از کم آپ نے ایک ایسی ہستی کو کئی بار دیکھا ہے جس سے مجھے بہت محبت ہے۔.... لیکن پھر بھی آپ کی انسبت کم۔"

"تو.... کیا آپ مجھے چاہتی ہیں؟"

"بے شک، ورنہ میں آپ سے ہمکلام کیوں ہوتی۔ میں ضرور آپ کو چاہتی ہوں اور کئی مہینے سے۔ اس وقت سے بھی پہلے جب کسی نے آپ کو وہ ایرانی تحفہ بھیجا تھا، کیا آپ کو یہ سکر خوشی ہوتی ہے یا افسوس؟"

"میں.... میں کہہ نہیں سکتا" سعید حسن نے کہا۔

"بڑا عجیب معاملہ ہے"

"اسی لئے تو مجھے اس میں لطف آتا ہے" آواز نے کہا۔

سعید حسن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ دونوں اندھیرے میں کسی خفیہ جگہ بیٹھے ہیں اور وہ اس سے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی ہے "کیونکہ ہم عورتوں کو کبھی موقع نہیں ملتا کہ بغیر بے حیا کہلائے کسی سے پہلے اپنی محبت کا اظہار کریں باوجودیکہ بعض اوقات ہمارے دل محبت سے بھرے ہوتے ہیں، آپ کو

میری باتوں میں بڑھاپے کی سی عقلمندی اور تجربہ کار کی سی بے شرمی محسوس نہیں ہوتی ؟"

سعید حسن کے دل میں ایک فوری خوف سا پیدا ہوا۔

"اگر آپ ایسی باتیں کرتی رہیں تو غالباً آپ کی طرف سے مجھے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا پڑے گا۔"

"کیوں ؟"

"کیونکہ آپ ——"

"—— اتنی سمجھدار ہیں ؟"

"بے شک" سعید حسن کو ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی اس نے پوچھا:-

"آپ ہنستی کیوں ہیں ؟"

"کیونکہ اب آپ پہلے کی نسبت زیادہ عقلمند معلوم ہونے لگے ہیں۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ آج تک آپ نے کبھی کسی لڑکی کو چاہت کی نگاہ سے دیکھا ہے ؟"

"نہیں، عملی طور سے نہیں، تصور میں ضرور کبھی کبھی۔"

"اچھا تو پھر آپ مجھے چاہئے نا، میرے لئے یہ ایک بڑی بات ہوگی اور میں اس آدھ گھنٹہ گفتگو پر پھولوں کے ہار چڑھایا کروں گی۔ غالباً میں دنیا میں پہلی لڑکی ہوں جس نے اس طرح باتیں کی ہیں اچھا تو اب آپ کہدیں نا کہ آپ مجھے چاہتے ہیں۔"

سعید حسن نے کہا "آپ واقعی عجیب و غریب ہیں۔ لیکن یہ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں۔"

"آپ کو مجھ سے نفرت تو نہیں ؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ کا نام کیا ہے ؟"

"جو آپ رکھ لیں۔"

"جو میں رکھ لوں ؟ تو گویا یہ بھی آپ نہیں بتائیں گی ؟"

"آج کل ہر قسم کے اُلٹے سیدھے بے معنی اور بے معنی نام رکھنے کا دستور ہے، آپ بھی کوئی گز بھر لمبا نام تجویز کر لیں —— امت البسم اللہ الرحمن الرحیم کی بابت آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"نہیں نہیں"

"تو بیچاری ہی کافی ہوگا۔ یہ بھی حسب حال" لہجہ تبدیل ہوگیا تھا اب اس میں معصومیت کا اثر تھا۔

"نہیں میں آپ کو "نادیدہ خانم" کہا کروں گا۔ لیکن ایک بات میں ضرور پوچھنا چاہتا ہوں، کیا آپ علیل ہیں ؟"

"ہاں لوگ کہتے تو یہی ہیں۔ لیکن ... کسی دن مجھے صحت ہو جاوے گی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اس کی آواز میں حد درجے کا اندوہ بھرا ہوا تھا اور سعید حسن اسے محسوس کر رہا تھا، آواز پھر آئی "کوئی آرہا ہے آپ کو بھی نیند آرہی ہوگی، اس لئے کل رات تک —— خدا حافظ۔"

سعید حسن کو امید تھی کہ اسے خواب میں دیکھے گا لیکن یہ امید بر نہ آئی۔ شاید اس کے خواب، دن اور عالم بیداری کے لئے مخصوص تھے، وہ ہر وقت سوچتا تھا اور حیران تھا کہ وہ کون ہے کہاں رہتی ہے ؟ اس کی عمر کیا ہے، صورت کیسی ہے ؟ اسے خیال آیا کہ اب کی دفعہ اس سے یہ پوچھے گا کہ اس کی بلی کس قسم کی تھی، اور اس روز راستے میں جتنی بلیاں ملیں انھیں بڑے غور سے دیکھتا رہا، لیکن جب رات آئی اور سلسلۂ کلام شروع ہوا تو مایوسی ہوئی کیونکہ جب عطیہ کا ذکر چھڑنے پر اس نے سوال کیا کہ آپ کی بلی کس قسم کی ہے تو جواب ملا کہ اس کی چار ٹانگیں ہیں، دو زرد آنکھیں ہیں، ایک دُم ہے، بدن پر بال ہیں ا پیار کرنے پر غُر غُر کرتی ہے" اس کے بعد قہقہہ کی آواز آئی۔

"تو اس کا مطلب تو فقط یہی ہے کہ وہ بلی ہے اور بس" ؟

"ہاں، اور کیا۔ اچھا جب آپ کی شادی ہو جائے تو جب آ اُداس ہوں اور آپ کی بیوی آپ کی اُداسی دور کرنے میں ناکامیاب رہیں تو مجھے ضرور یاد کیجئے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا ک میری خاک کے ذرے ستاروں کی طرح چمکنے لگیں گے۔"

"آپ کی خاک ؟ آپ کی خاک کیوں ؟ کیا آپ سقدر علیل

"ہاں، سب لوگ اب یہی کہتے ہیں، گو زبان سے نہیں بلکہ حسرت بھری نگاہوں سے"۔

"تو کیا آپ قریب الموت ہیں؟"

"آپ زرد کیوں ہو گئے؟ ہاں، بیشک میرا آئینہ یہی کہتا ہے"

"میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں، ایک بار، صرف ایک بار!"

"اس کا وقت گزر چکا ہے، ——— میں چاہتی ہوں کہ آپ اسی صورت کو یاد رکھیں جو آپ کے دل میں ہے کیونکہ اگر اب کبھی میں حسین ہو سکتی ہوں تو صرف اس دل میں جس میں میری محبت پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔

"میں واقعی آپ کو چاہنے لگا ہوں - کیا آپ کی زندگی کی کوئی امید نہیں ہے؟"

"نہیں، لیکن مجھے خوشی ہے کہ اس آخری وقت میں جب میں قریباً خاک ہو چکی ہوں میں آپ سے گفتگو کر سکی، کیونکہ میری خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کوئی دل میرے لئے بے قرار ہو، اور کوئی چہرہ ایسا بھی ہو جس پر میرا خیال آنے سے سرخی آ جائے"۔

سعید حسن نے کہا "میں اب محسوس کرتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے"۔

اس شب اور کوئی گفتگو نہ ہوئی پھر بھی سعید حسن جانتا تھا کہ وہ اس آواز کو دل دے چکا ہے، تمام دن جہاں کہیں بھی ہوتا وہ آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہتی - اس کے احباب اس کی حالت دیکھ کر حیران تھے لیکن ایک دوست جو نادانی سے زیادہ سمجھدار تھا کہا کرتا کہ سعید عبادت کرنے لگ گیا ہے" اور وہ سچ کہتا تھا کیونکہ عبادت محبت نہیں تو محبت عبادت ضرور ہے۔

یہ برقی ملاقات کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور لڑکی کے زرد چہرہ پر رونق آنے لگی، اس کے تیمارداروں کو خیال ہوا کہ شاید وہ روبہ صحت ہے، لیکن وہ خود مایوس تھی - وہ اپنی قسمت و جرات کی شکرگزار تھی جس نے محبت کے حصول کو ممکن بنا دیا تھا - اسے معلوم ہوتا تھا گویا وہ صرف اسی کے لئے دنیا میں آئی تھی، وہ خوش تھی کہ جب وہ نہ ہوگی تو کسی کے دل میں اس کی یاد باقی ہوگی، کیونکہ کسی شے کی یادگار باقی رہنا گویا اس کا غیر فانی ہو جانا ہے۔

ایک روز ڈاک میں سعید حسن کو ایک پارسل ملا جس میں ایک چھوٹی سی رنگین تصویر تھی، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چنگاریاں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں، سیاہ بال تھے اور صورت نہایت دلفریب تھی، اسے فوراً اپنی ٹیلیفون والی ساحرہ کا خیال آیا اور اس کے منہ سے نکلا یہ "وہی ہے" لیکن تصویر اگر اسی کی تھی تو کچھ عرصہ پہلے کی تھی ——— کیونکہ اس میں علالت کا کوئی نشان چہرہ پر نہ تھا رنگت صاف، سرخ و سپید تھی اور چھوٹے چھوٹے ہونٹوں میں جن پر ہلکی سی شوخی بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی ایک خاص قسم کی شیرینی آمیز مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔

اس نے وہ تصویر کسی کو نہ دکھائی - بازار سے ایک طلائی لاکٹ خرید کر اسے چھاتی پر اپنے دل کے قریب آویزاں کر لیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔

آخرکار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور سعید حسن نے پوچھا:-

"کیا تم ہی ہو؟"

"ہاں میں ہی ہوں"

"آپ نے جو چیز بھیجی تھی مجھے مل گئی"

"کیا چیز؟"

"وہی ننھی سی دلفریب تصویر"

"کسی اور لڑکی نے جسے آپ سے محبت ہے آپ کو اپنی تصویر بھیج دی ہوگی، میری نہیں"۔

"آپ کی تصویر ہے میں خوب جانتا ہوں"۔

"یہ سچ ہے کہ مجھے آپ سے الفت ہے، لیکن میں صرف آواز ہوں اور آواز بغیر شخصیت کے ایک خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی - کیا وہ لڑکی جس نے اپنی تصویر آپ کو بھیجی ہے، حسین ہے؟"

"بے حد"

"تو مجھے اس سے نفرت ہے، شاید کسی گزشتہ زمانے میں میں بھی ویسی تھی، لیکن اب آپ اسے ایک طرف رکھ دیں اور میری بات سنیں"۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

"آج ایک اور ڈاکٹر میرے معالج کے ساتھ آیا تھا....."

"اس نے کیا کہا۔ کچھ امید دلائی؟"

"بہت کم۔ وہ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور اس کی بھویں ہلتی رہیں، میں جانتی تھی کہ سوچ رہا ہے، یک لخت اس نے کوئی ایسی بات کہی کہ مجھے ہنسی آگئی۔ پھر وہ چپ ہو کر سوچنے لگ گیا اور اس کے بعد مجھ سے کہنے لگا کہ تم بہت حوصلہ مند ہو۔ اس کی شکل نپولین کی تصویر سے ملتی تھی۔"

"اس نے کچھ کہا بھی؟"

"اس نے مجھے عجیب عجیب باتیں سنائیں۔ ایک یہودی لڑکے کی کہانی سنائی جو بہت علیل اور بمشکل چھ سال کا تھا، اس کے باپ نے اس سے کہا کہ اگر تم جلدی تندرست ہونے کی کوشش کروگے تو میں تمھیں بہت سے روپے انعام دوں گا۔ لڑکے نے آنکھیں کھولے بغیر فوراً سوال کیا "کتنے؟" مجھے فقط یہی بات یاد رہ گئی ہے، کیونکہ اس کے بعد نپولین کہنے لگا کہ اب ہمیں باتیں چھوڑ کر کچھ کرنے کا خیال ہونا چاہئے۔"

"کیا؟ خدا کے لئے بتاؤ کیا؟"

وہ کہتا تھا کہ مجھے بیمار ہونے کی سزا ملنی چاہئے، بیمار ہونا اور تندرست ہونے کی کوشش نہ کرنا بہت بری بات ہے اور اس کی پاداش میں وہ مجھے..... اور، تو میں کچھ نہیں جانتی فقط اتنا میری سمجھ میں آیا کہ اس میں کلوروفارم اور نشتروں اور اوزاروں کا ذکر تھا اس کے بعد ڈاکٹر نے اپنی ٹھوڑی کو ٹٹولا، اور کہنے لگا کہ تم تندرست ہو جاؤ گی۔"

"اللہ کا شکر ہے، اس ڈاکٹر کا نام کیا ہے؟"

"نپولین، میں اسے یہی کہہ کر بلاتی ہوں اور آپ کی تسلی کے لئے بھی اتنا ہی نام کافی ہونا چاہئے ورنہ مجھے خوف ہے کہ آپ اپنی قسم توڑنے کی فکر شروع کر دیں گے۔"

"خیر کوئی بھی ہو، ایک بار آپ تندرست ہو لیجئے، مجھے ایک ایک کر کے ان تمام باتوں کی آپ کو سزا دینا ہو گی۔"

"تو آپ کو میری صحت کا یقین بھی ہو گیا کیا؟ اتنے خوش نہ ہو جائیے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور ڈاکٹر سے بھی میں نے کہہ دیا تھا کہ یہ اس کی آخری کوشش ہے۔"

"نہیں، نہیں آپ یہ نہ کہیں۔ اور یہ عمل کب ہو گا؟"

"کل صبح دس بجے۔ اب میری نرس آرہی ہے صبح آٹھ بجے کیا آپ مکان ہی پر ہوں گے؟ اس وقت میں خدا حافظ کہوں گی۔"

"ضرور میں آپ کی آواز کا انتظار کروں گا۔"

سعید حسن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے آواز افسردہ تھی۔

صبح آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی آواز آئی "خدا حافظ"

سعید حسن نے کہا "تم بڑی ظالم ہو۔"

"میں ظالم؟ کیونکر؟"

"میں آپ کو دیکھ نہیں سکتا، کچھ کر نہیں سکتا، خدا کے لئے مجھے اپنے پاس آنے دو۔ میں آپ کے والدین سے اجازت لے لوں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہ کریں گے۔"

"واہ کیا کہنے! آپ اتنی محنت سے بنائے ہوئے طلسم کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اگر مجھے صحت ہو گئی تو انشاءاللہ پھر ملاقات ہو گی۔ اور اگر نہیں تو مجھے آپ اس لڑکی کی شکل میں یاد رکھیں جس کی تصویر آپ کے پاس ہے اور جو آپ کو دل سے چاہتی ہے، جب اور سب لوگ مجھے بھول جائیں گے تو آپکے دل میں میری یاد باقی ہو گی۔ میرے لئے فقط اتنا ہی کافی ہے۔"

"آپ کی یاد اب فراموش نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے علم کس طرح ہو گا؟ اب غالباً کئی دن تک مجھ سے گفتگو نہ کر سکیں گی۔"

لڑکی نے آہ بھر کر جواب دیا "ہاں کئی دن تک، لیکن میں نے دو خط لکھ کر ایک جگہ رکھ دئے ہیں جن میں سے ایک آپ کے نام ہے، اگر میں شہر خموشاں کو سفر کر گئی، تو وہ آپ کو مل جائے گا، میں بالکل خوش ہوں اور موت کے نام سے مجھے بالکل خوف نہیں آتا... کیونکہ آپ مجھے چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو ہمیشہ چاہوں گا۔"

"اچھا تو اب آپ اس تصویر سے جو آپ کے پاس ہے باتیں کر اور میرے لئے دعا۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" سعید حسن کا گلا گھٹا جا رہا تھا اور آواز بمشکل نکلتی تھی

اس روز دفتر سے واپس آتے وقت وہ راستے کے ہر ایک مکا

کی طرف بغور دیکھتا تھا، کہ کہیں کسی کے جنازے کی طیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں - لیکن اسے کوئی ایسا مکان نہ ملا اور اس بات سے اس کے دل کو قدرے راحت محسوس ہوئی گو رات میں وہ وحشت انگیز خواب ہی دیکھتا رہا اور بار بار اس خیال سے چونک پڑا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن جب بیدار ہوتا تو سناٹا نظر آتا -

---

دوسرے دن وہ راستہ میں سہراب کو پیار کر رہا تھا کہ یکلخت اسے معلوم ہو گیا کہ وہ بلی "نادیدہ خانم" کی تھی کیونکہ اس کے بالوں میں سے ہسپتال کی سی بو آ رہی تھی، غالباً وہ اپنی مالکہ کے کمرے میں بیٹھی رہی تھی اور وہاں سے اس کے بالوں میں ان دواؤں کی بو بس گئی تھی جو اس کمرے میں استعمال ہو رہی تھیں -

سعید کی نظر مکان کی کھڑکیوں کی طرف اُٹھ گئی اور گو اور کوئی ثبوت سوا بو کے موجود نہ تھا تاہم اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی جگہ رہتی ہے - یہ مکان اس کے مکان سے نزدیک ہی تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس میں ایک معزز اور شریف سرکاری عہدہ دار کا قیام تھا جس کے اُس کے والد سے کافی مراسم تھے وہ اس کی لڑکی ہوگی ... اور چونکہ قومیت وغیرہ میں بھی کوئی فرق نہ تھا .... غالباً رشتہ ہو جانے میں کوئی مشکل نہ ہوتی .... یا خدا! اے میرے پروردگار! اس کو صحت عطا کر دے!

اگلے روز صبح کو جب وہ دفتر جا رہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک موٹر اس کی معشوقہ کے مکان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور اس میں سے ایک انگریزی وضع قطع کا شخص بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے اُترا، اس کے چہرہ پر نظر پڑنا تھی کہ سعید حسن کو نپولین والی تشبیہ یاد آ گئی، کیونکہ اس ڈاکٹر کے خط و خال نپولین سے مشابہ تھے -

وہ ٹھہر گیا اور سڑک پر ٹہل کر ڈاکٹر کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا - کھڑکیوں کی طرف نظر اُٹھانے پر اس نے دیکھا کہ بالائی منزل کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سہراب بیٹھا دھوپ کے مزے لے رہا ہے، اسے خیال آیا "یہ اُس کا کمرہ ہے" ہر منٹ ایک گھنٹہ کے برابر معلوم ہوتا تھا، لیکن آخر کار ڈاکٹر مکان سے نکلا اور سعید حسن نے آگے بڑھ کر مکان کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا :-

"کیا آپ کے خیال میں صحت ہو جائے گی"

"امید تو ہے، انشاءاللہ"

سعید حسن نے بمشکل شکریہ ادا کیا - کیونکہ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور دفتر کو چلا گیا - دوسرے اور تیسرے دن انتظار میں رہا - لیکن ڈاکٹر سے نہ مل سکا، اگلے روز اتنا بیتاب تھا کہ دفتر بھی نہ گیا، اور تمام دن اپنے صحن میں ٹہل کر گزار دیا - لیکن خیالات کی محویت کی وجہ سے ڈاکٹر آیا بھی اور چلا بھی گیا اور اُسے خبر نہ ہوئی اس کا کئی بار اپنے احاطہ سے نکل کر دوسرے مکان کی طرف دیکھنا بیکار ثابت ہوا -

اس نے رات کا کھانا نہ کھایا اور لیٹ گیا - مدت کے بعد نیند آئی تو خواب میں دیکھا کہ ایک روح سفید لباس پہنے ہوئے اس سے کہہ رہی ہے کہ :- "میں مر گئی ہوں اور اب ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں" وہ گھبرا کر اُٹھا - اس کے دماغ پر سیکڑوں من کا بوجھ تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سو گیا - پھر جاگا اور پھر سو گیا - اس کا تکیہ آنسوؤں سے تر تھا اور اس یقین سے کہ جس بات کا اسے خوف تھا وہ سامنے آ گئی، اس کے ہیجان میں قدرے تسکین کی صورت پیدا ہوتی معلوم ہوتی تھی -

لیکن دفعتاً وہ چونک اُٹھا اور سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا - اس کا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا -

کیونکہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی اور جب وہ گھبرا کر اُٹھا اور فون لیا تو صرف ایک طویل قہقہہ سُنا اور اس کے بعد کامل خاموشی!

فراست الید اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی ساخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل عروج و زوال، موت و حیات پر پیشین گوئی کر سکتا ہے - قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

باب الاستفسار

(۱)

رسول اللہ کے معجزے

(سید رحمت اللہ صاحب - کراچی)

سیرت کی کتابوں میں رسول اللہ کے معجزوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے اور عام طور پر جو معجزے آپ سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سب سے بڑا معجزہ شق القمر ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد معجزے آپ کے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کی کنکریوں کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا، استن حنانہ کا آپ کے فراق میں آنسو بہانا، آپ کے جسم کا سایہ نہ ہونا، آپ کی پشت پر مہر نبوت کا پایا جانا وغیرہ وغیرہ۔ سو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے ان معجزوں کے بارہ میں کیا ہے۔ نیز یہ کہ رسول نے کوئی معجزہ پیش کیا بھی تھا یا نہیں، اگر کیا تھا تو وہ کون سا معجزہ تھا۔

(نگار) آپ نے رسول اللہ کے جن معجزوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے میں کسی کا قایل نہیں۔ آیئے سب سے پہلے اس امر پر غور کریں کہ معجزہ کسے کہتے ہیں اور ضرورت و نتیجہ کے لحاظ سے اسے کیا اہمیت حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں، لمبی چوڑی بحث کرنا غیر ضروری ہے جو فقہ و کلام کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ علماء کے نزدیک معجزہ کا مفہوم ہے کسی نبی کی طرف سے ایسے امر کا ظہور جس کے کرنے پر دوسرا قادر نہ ہو۔ اور اگر کسی غیر نبی کی طرف سے کوئی محیر العقول امر ظاہر ہوگا تو اسے معجزہ نہ کہیں گے بلکہ اسے نظر بندی یا شعبدہ کے نام سے موسوم کریں گے، اسی لئے مذہبی کتب میں نبی اور معجزہ کا جو ملا جلا مفہوم پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "نبی وہ ہے جو کوئی معجزہ پیش کرے اور معجزہ وہ ہے جو نبی کی طرف سے پیش کیا جائے۔" دلیل و بیان کی سطحیت ظاہر ہے کیونکہ اس طرح معجزہ و نبوت دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہو جاتے ہیں اور حقیقت ان میں سے کسی کی واضح نہیں ہوتی۔

"شرح مواقف" میں علامہ سید شریف نے معجزہ کا اصطلاحی نام یہ ظاہر کیا ہے:-

"المعجزۃ عندنا ما یقصد بہ تصدیق مدعی الرسالۃ وان لم یکن خارقاً للعادۃ۔"

(یعنی ان کے نزدیک معجزہ وہ ہے جس سے کسی مدعی رسالت کی تصدیق مقصود ہو خواہ وہ عادتاً محال نہ ہو)

شاہ ولی اللہ بھی اپنی مشہور کتاب "تفہیمات الٰہیہ" میں بھی لکھتے ہیں:-

"انما المعجزات والکرامات امور اسبابیۃ ولم تترک الاسباب قط ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکابر علماء کے نزدیک معجزہ کا تعلق محالات عقلی سے نہیں بلکہ ان امور سے ہے جو عام طور پر ظہور میں نہیں آتے لیکن اسباب کے تحت ان کا ظہور ممکن ہے۔

بنابراں معجزہ کا تعلق محالات عادی سے ہے محالات عقلی سے نہیں اور اس صورت میں اس کی تخصیص کسی نبی کے ساتھ

کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب کسی محال عادی کے ظہور کے اسباب پیدا ہو جائیں گے وہ ظاہر ہو جائے گا۔

آپ نے جن معجزات کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق زیادہ تر محالاتِ عقلی سے ہے اس لئے وہ قابل قبول نہیں۔ علاوہ اس کے سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ خود رسول اللہ نے بھی کبھی معجزہ دکھانے کا دعوی نہیں کیا۔

کفار کہتے ہیں کہ "ہم آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے چشمے نہ جاری کر دے، یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور تو اس میں بہتی ہوئی نہریں نہ دکھائے، یا یہ کہ آسمان کے ٹکڑے نہ کر ڈالے وغیرہ وغیرہ۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیات ۹۲-۹۵) اور رسول اللہ اس کے جواب میں کوئی معجزہ پیش کرتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں:- "ہل کنت الا بشرا رسولا" میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور معجزہ دکھانا میرا کام نہیں۔ "الآیات عند اللہ وانما نذیر مبین" یعنی ایسی نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں، میں تو صرف تم کو تمہارے برے انجام سے ڈرانے آیا ہوں"۔

آپ نے جن بعض مشہور معجزوں کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے بڑا معجزہ شق القمر کا ہے کیونکہ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے (وانشقت القمر) لیکن میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا، کیونکہ اول تو یہ بڑا پامال سا مبحث ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خاصی طویل گفتگو چاہتا ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ معجزۂ شق القمر کی کوئی اصلیت نہیں ہے اور قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر نہیں۔ "انشقت القمر" والی آیت کا تعلق اس معجزہ سے بالکل نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں آیندہ کے انقلاب کی خبر دی گئی ہے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بھی یہی رائے ہے:- "اما شق القمر فعندنا لیس من المعجزات"۔

آپ نے جن دوسرے معجزوں کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز وہ معجزہ ہے جس کا تعلق جسم نبوی کے سایہ سے ہے مجھے حیرت ہے کہ لوگ رسول اللہ کی حاجت بول و براز کو تو تسلیم کرتے ہیں جو بہت کثیف بات ہے اور سایۂ جسم سے انکار کرتے ہیں جو بدرجہا لطیف چیز ہے۔ لیکن خیر یہ تو ضمنی باتیں تھیں، اب آئیے ان سے گزر کر سنجیدگی کے ساتھ سب سے پہلے اس حقیقت پر غور کریں کہ معجزہ کی ضرورت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر نبی کی عظمت اور اس کے رسول خدا ہونے کا اعتراف کریں اور اس کے کہنے پر چلیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقصد معجزوں سے پورا ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معجزوں سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ کونسا نبی یا رسول ایسا تھا جس کی طرف سے معجزہ دکھانے کا ذکر کتب مقدسہ میں نہ پایا جاتا ہو اور وہ کونسی قوم ایسی تھی جو صرف معجزوں کو دیکھ کر ایمان لے آئی ہو۔ انبیاء برابر معجزے دکھاتے رہے اور لوگ برابر ان کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن ہم اپنے رسول کے بابت تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے معجزہ دکھانے کا کبھی کوئی دعوی کیا ہو، بلکہ انھوں نے تو اس مطالبہ پر صاف صاف کہدیا کہ میں تو صرف تمہارا ہی جیسا ایک انسان ہوں اور معجزہ دکھانے سے انکار کر دیا۔

علاوہ اس کے یوں بھی غور کرنے بات ہے کہ اگر رسول اللہ کا جسم بے سایہ ہوتا تو یہ ایسی بات نہ تھی کہ کفار مکہ اس سے بے خبر رہتے۔ ہر شخص بہ آسانی ہر وقت دیکھ سکتا تھا کہ جب آپ دھوپ میں باہر نکلتے ہیں تو آپ کے جسم کا سایہ نہیں پڑتا اور وہ اس عجیب و غریب بات کو دیکھ کر وہ فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ بہر حال یہ اور اسی قسم کی روایات قطعاً بے بنیاد ہیں اور کسی طرح قابل اعتناء نہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات قابل غور یہ ہے کہ انبیاء و رسل کے بھیجے جانے کا مقصد کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگ اچھے اخلاق اختیار کریں اور نظام تمدن میں عضو مفید بن کر رہیں۔ سو اس مقصد کی تکمیل معجزوں کی نمائش نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے صرف عملی اخلاق کے پیش نظر کرنے کی ضرورت ہے اور اگر کوئی نبی اس تعلیم اخلاق کے سلسلہ میں ------ کوئی ایسی غیر معمولی مثال علوئے نفس و پاکیزگیٔ کردار کی پیش کر سکے جس کی عامۃ الناس سے توقع نہیں کی جا سکتی، تو ہم

اس کو یقیناً معجزہ کہیں گے اور ہمارے رسول کی ساری زندگی انھیں اخلاقی معجزوں کا مظہر اتم تھی۔

---

(۲)

تیسری عالمی جنگ اور جمہوریت و اشتراکیت کا مستقبل

(علی عباس صاحب - فیروزپور)

میں بہت صاف اور کھلے ہوئے لفظوں میں جاننا چاہتا ہوں کہ دُنیا کی تیسری عالمی جنگ کے بارہ میں آپ کا ذاتی خیال کیا ہے۔ وہ شروع ہوگی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کب تک۔ نیز یہ کہ اس جنگ میں جمہوریت و اشتراکیت کا موقف کیا ہوگا اور کامیابی کس کو حاصل ہوگی، نیز یہ کہ ان کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے اور یہ کہ بہترین نظام حکومت آپ کے نزدیک کیا ہے۔

(نگار) غیب کی خبریں بتانے کا زمانہ اگر کبھی آیا تھا تو وہ ختم ہو چکا۔ اب تو صرف موجودہ حالات و اسباب کو سامنے رکھ کر آیند
پر کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے لیکن یقین کے ساتھ نہیں، کیونکہ موجودہ حالات نہایت تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں اور کچھ نہیں کہ
جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہ رہا ہے اور ہر گھڑی رخ بدلتا جا رہا ہے، اس لئے یہ کہنا بہت
مشکل ہے کہ موجودہ نظام تمدن و حکومت اسی حال پر قایم رہے گا یا وہ کوئی دوسری صورت اختیار کرے گا۔
پھر ہو سکتا ہے کہ آپ یا کوئی اور اسے زمانۂ امن سے تعبیر کرے۔ لیکن میری رائے میں دُنیا اس وقت حد درجہ خطرناک
دور سے گزر رہی ہے، جسے عام طور پر جنگ و ناجنگی کے درمیان کا برزخی عہد سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تیسری عا
جنگ شروع ہو چکی ہے اور اس کا آغاز دوسری جنگ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔
بعض اہل فکر و سیاست اس کو ٹھنڈی لڑائی کہتے ہیں اور آیندہ گرم لڑائی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن میری را
میں موجودہ کشمکش برابر اسی طرح قایم رہے گی اور گرم لڑائی کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔
مجھے یقین ہے کہ تیغ و تفنگ کے استعمال کا زمانہ گزر گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم موجودہ جنگ سرد جنگ نہیں بلک
سخت گرم جنگ ہے، ذہن و اعصاب کی اور بالکل ویسی ہی ہے جیسے دو پہلوان صرف اپنے اعصاب و عضلات کی قوت یا د
پیچ کی مدد سے ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کریں۔ اور یہ جنگ عرصہ ہوا شروع ہو چکی ہے۔ اور اب تک جاری
کہنے کی ضرورت نہیں، ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ یہ جنگ قوموں، ملکوں اور سلطنتوں کی جنگ نہیں بلکہ تصو
کی جنگ ہے اور انھیں تصورات و عقاید کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کی کوشش میں اشتراکیت و جمہوریت دونوں اپنی اپنی جب
مصروف و منہمک ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ اس کشاکش کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کا فیصلہ صرف اشتراکیت کی جارحانہ پیچ اور جمہوریت
مدافعانہ تدابیر ہی کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے، سو آئیے اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں، ممکن ہے کوئی بات سمجھ میں آجا
میں نے اشتراکیت کو جارحانہ حیثیت دی ہے اور جمہوریت کو مدافعانہ، کیونکہ ان دونوں کا موقف در اصل یہی ہے۔
دُنیائے اسباب و علل میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہمیشہ ٹھوس واقعات یا حقایق ظاہرہ ہی کو سامنے رکھنا پڑتا

اور جب ہم ان پر نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس قوت کو میں نے جارحانہ کہا ہے وہ واقعی جارحانہ ہے اور جسے میں مدافعانہ کہتا ہوں وہ مدافعانہ سے زیادہ نہیں اور مسابقت کی دُنیا میں کامیابی ہمیشہ اسی کو ہوتی ہے جو جارحانہ قدم اُٹھائے مدافعانہ جذبہ ایک Passive جذبہ ہے اور اس کی سب سے بڑی جیت یہی ہے کہ وہ فنا نہ ہو۔

اب آپ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اشتراکیت کی تاریخ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب سے ۴۰ سال قبل جو خیال لینن کے دل میں محض ایک وہم سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا آج وہ دنیا کے ایک ارب انسانوں کا مذہبی عقیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ کیا کسی تحریک کی کامیابی کی اس سے زیادہ واضح مثال کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عقیدۂ اشتراکیت اپنی جگہ صحیح ہے یا غلط، مناسب ہے یا نامناسب بلکہ صرف اس امر پر غور کیجئے کہ اسے اتنی کامیابی کیوں حاصل ہوئی، پھر اگر یہ نتیجہ اس کی صلاحیت کا نہ تھا تو حسن تدابیر کا ضرور تھا اور اسی حسن تدبیر کو جمہوریت صرف ٹھنڈی لڑائی کہتی ہے اور یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ وہ دراصل اس کی شکست ہے ——— اس سلسلہ میں دونوں کا نقطۂ نظر اور دونوں کی زور آزمائی کے اسلوب و نتائج پر غور کیجئے تو آپ کو بین فرق نظر آئے گا۔

جمہوریت کا محاذ صرف وہ ممالک ہیں جو اشتراکیت پسند ہیں، لیکن اشتراکیت ساری دُنیا کو میدانِ جنگ سمجھتا ہے۔ جمہوری بلاک یہ گوارا کر سکتا ہے کہ ایک ملک اشتراکیت سے جدا رہ کر الگ تھلگ زندہ رہے، لیکن اشتراکیت اس کی قایل نہیں، اس کا اصول یہ ہے کہ جو ہم میں سے نہیں ہے وہ ہمارا فریق مخالف ہے۔ اس لئے اس کا میدانِ جنگ بہت وسیع ہے اور اسی وسعت کے پیش نظر وہ ذہنی، اعصابی، سیاسی، نفسیاتی اور اقتصادی ہر حیثیت سے جنگ میں مصروف ہے اور یہی ہے وہ لڑائی جو روس ساری دُنیا سے لڑ رہا ہے اور جمہوریت اب تک تیسری عالمی جنگ کا انتظار کر رہی ہے، حالانکہ وہ اس جنگ میں بارہا شکست کھا چکی ہے۔ شکست کے معنی صرف یہ نہیں کہ کسی ملک کے مقبوضات اس سے چھین لئے جائیں، بلکہ شکست نام اس کا بھی ہے کہ بغیر جنگ کے فریق کے مقبوضات و اثرات وسیع ہوتے جائیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے آج کتنے ممالک ایسے ہیں جو جمہوری بلاک سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں اور اگر وہ اشتراکی بلاک میں شامل نہ ہوں تو بھی اشتراکیت کی یہ کامیابی کم نہیں، رقیبوں سے دامن کشاں گزر جانا بھی بڑی بات ہے۔

امریکن بلاک کوشش کر رہا ہے صرف اس بات کی کہ اس کے اثرات دوسرے غیر اشتراکی ممالک میں کم نہ ہونے پائیں جو اُس کی شکست ہے اور روس انھیں اثرات کو کم کرتا جا رہا ہے جو اس کی فتح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مسابقت میں مغرب بھی کلہ بکلہ جواب دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور جب کوئی موقع ایسا جاتا ہے تو خم ٹھونک کر سامنے آجاتا ہے، لیکن آخر میں ہوتا یہ ہے کہ ہر اقدام کے ساتھ روس کی کامیابی کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔

کوریا اور ویت نام میں امریکن بلاک نے بڑا زور مارا تو ہوا صرف یہ کہ وہ اپنے اصلی حال پر قایم رہے اور اشتراکی نہ ہو سکے، برخلاف اس کے اشتراکیت نے زیکوسلوویکیا، چین، انڈو چائنا پر چھا کر اپنے لئے زمین اور زیادہ وسیع کر لی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسلحہ بندی کے سلسلہ میں روس بہت پیش پیش نظر آتا ہے اور جنگ کی مخالفت کا بڑا حامی ہے (حالانکہ وہ اسلحۂ جنگ کی طیاری میں بڑی ترقی کر چکا ہے)۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ دنیا کو آتشیں اسلحہ اور عسکری قوت سے فتح کرنا ہی نہیں چاہتا (کیونکہ وہ جانتا ہے، اس کے بعد اگر اسے کامیابی ہوئی بھی تو کیا؟ — وہ ایک ویران کرۂ زمین کو لیکر کیا کرے گا) بلکہ وہ صرف اپنی نفسیاتی و سیاسی تدابیر سے یہ لڑائی لڑ کر ساری دنیا پر قابض ہو جانا چاہتا ہے۔

پھر یہ سب کچھ عارضی جوش نہیں بلکہ ایک مستحکم عقیدہ ہے، زندگی کا متعین پروگرام ہے جسے کارل مارکس نے وضع کیا تھا اور اب آہستہ آہستہ بروئے کار آ رہا ہے، جلد یا دیر کا کوئی سوال نہیں۔

روس اسلحہ کی لڑائی کا قایل نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے ذہنی مطمح نظر تک نہیں پہونچ سکتا ہے، وہ قایل ہے ڈپلومیسی، سائنس، صحافت، مالیات، اقتصادیات، اور پروپاگنڈا کی جنگ کا، یہاں تک کہ وہ مغرب کی دولت، مغرب کی عسکریت اور مغرب کی استعماریت کو بھی فرائیڈ کے نظریہ کے مطابق ایک نفسیاتی اُلجھن ثابت کرکے انسانیت کو اس سے متنفر کرنا چاہتا ہے یا اس کو دور کرنے کا درس دیتا ہے۔

روس کے اصول جنگ بالکل مختلف ہیں اور وہ جمہوری تحریکات کو بھی اپنے ڈھب پر لاکر فایدہ اُٹھا لیتا ہے، چنانچہ مجلس اقوام کے وجود سے بھی وہ وہی فایدہ اُٹھا رہا ہے جو اسلحہ جنگ سے اُٹھا سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ روس کی پالیس بڑی عجیب وغریب ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں جب لینن نے اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ کر جرمنی سے علٰحدہ صلح کرلی تو گویا روس ۳۴ فی صدی آبادی اس نے جرمنی کو حوالہ کردی۔ لیکن یہ اس کی بڑی دوررس پالیسی تھی جس سے اس نے دوسری جنگ میں فایدہ اُٹھایا اور جو کچھ جرمنی کو دیا تھا اس سے کہیں زیادہ حاصل کرلیا۔ یعنی اسٹالین نے شرقی و وسطی مغرب کی ان حکومتوں سے جو نازی اثرات میں تھیں علٰحدہ کوئی صلح نہیں کی، بلکہ اپنے مغربی اقدام میں ڈھیل ڈال کران حکومتوں میں خلا پیدا کردیا اور بعد کو کمیونسٹ حکومت نے اپنے وجود سے اس خلا کو پر کردیا۔ اس سے زیادہ عجیب وغریب مثال روس کی ہوشیاری کی ملاحظہ ہو:

جب ۱۹۴۴ء میں روسی فوجیں حدود وارسا تک پہونچ گئیں تو انھوں نے ریڈیو کے ذریعہ سے پولینڈ کی محب وطن فوجوں کو جو چھپی ہوئی تھیں باہر نکل کر نازیوں کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ پولینڈ کی فوجیں یہ سمجھ کر کہ روسی فوجیں بھی ان کی مدد کریں گی نازی فوجوں کے مقابلہ میں آگئیں، لیکن روسی افواج نے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب پولینڈ کے ۴۰ ہزار سپاہی کام آگئے تو اس نے بڑھ کر نازیوں کو نکال باہر کیا (کیونکہ ان کی قوت اب بہت گھٹ گئی تھی) اور وارسا میں لوبلن کی کمیونسٹ حکومت قایم کردی۔ اگر اتحادئین روس کی اس چال سے واقف ہوکر اسے کالعدم کر دیتے جو چنداں دشوار نہ تھا تو آج بقول لکس ایسٹ مین، دُنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

پھر اس کے بعد ماسکو، تہران، یالٹا، اور پوٹسڈم کی کانفرنسوں کو دیکھئے کہ اسٹالین نے چرچل، روزولٹ اور ٹرومین کو کتنا بیوقوف بنایا اور وہ مطلق نہ سمجھ سکے کہ اس کی آستین میں کیسا تیز دشنہ چھپا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں روس بڑا شاطر کھلاڑی ہے اور اس کی چالوں کا مشکل ہی سے پتہ چلتا ہے، جب مصر ضغطہ میں مبتلا ہوتا ہے اور فرانس و برطانیہ سے اس کی بگڑی اُلجھتی ہے تو روس پہلے اسے اسلحہ کی پیش کش کرتا ہے اور پھر ایک پوری بٹالین ماہرین فن کی وہاں پہونچا دیتا ہے۔ مغربی اقوام بندوق اپنے کندھے پر رکھ کر چلاتی ہیں اور روس دوسروں کے کندھوں پر اور یہی اس کی بڑی کامیابی ہے۔ مغربی اقوام اپنے اقدام کے لئے وجہ جواز ہی ڈھونڈھا کرتی ہے اور روس کو ناخواندہ مہمان بننے میں بھی کوئی عار نہیں۔

روس نے اس زمانہ میں اپنی فوجی طیاری اور نئے نئے آتشبار اسلحہ کا بڑا پروپاگنڈا کیا ہے جو بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعی جنگ پر آمادہ ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ مغربی ممالک اپنی کافی دولت طیاری جنگ میں بیکار صرف کرتے رہیں، حالانکہ روس جنگ کا موقع کبھی آنے ہی نہ دے گا اور وہ کیوں آنے دے جبکہ اس کا مقصد جنگ کے بغیر ہی پورا ہو رہا ہے اور مغربی ممالک کی استعماریت اور ان کا سیاسی و اقتصادی اقتدار روز بروز ختم ہوتا جارہا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت اشتراکیت ساری دنیا پر چھا جائے گی اور اگر کسی قوم نے اشتراکی مذہب اختیار نہ کیا تو بھی اشتراکی اثرات بڑی حد تک قبول کرلے گی۔ لیکن میرا خیال اس باب میں کچھ ہے، اور وہ یہ کہ موجود

اشتراکی تحریک کا رُخ وہ نہیں رہے گا جو اس وقت پایا جاتا ہے۔ اس میں رفتہ رفتہ ذہنی و اصولی تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں گی، جن کے اثرات نمایاں ہو چلے ہیں۔ لینن کا روس، اسٹالین کے روس سے مختلف تھا۔ خرشچوف کا روس، اسٹالین کے روس سے مختلف ہے اور ہو سکتا ہے کہ خرشچوف کا روس کسی اور اوقت کے روس سے مختلف ہو۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ جس تیسری عالمی جنگ کا دھڑکا لگا ہوا ہے، وہ عرصہ ہوا شروع ہو چکی ہے، لیکن یہ جنگ آتشیں اسلحہ کی جنگ نہیں ہے بلکہ بلڈ پریشر (فشار الدم) کا سلسلہ ہے جو آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ نظام عالم کس وقت مفلوج ہو جائے۔

اب رہا سوال میری ذاتی رائے کا اشتراکیت و جمہوریت کے متعلق، سو میری رائے میں دونوں اصلاح طلب ہیں اور دنیا کا بہترین نظام حکومت صرف وہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ ممکن ہے یہ سُن کر آپ کو تعجب ہو لیکن حقیقت یہی ہے جو میں نے عرض کی۔

افسوس ہے کہ یہ موضوع بڑی تفصیلی گفتگو کا محتاج ہے اور بہ سلسلۂ استفسار اس بحث کو چھیڑنا مناسب بھی نہیں، لیکن امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ایک مستقل مقالہ اس موضوع پر پیش کر سکوں گا، تاہم مختصراً اس قدر ظاہر کر دینے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ میری رائے میں جمہوری نظام، اشتراکی نظام کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب صرف یہ ہے کہ اشتراکی نظام انسان کی انفرادیت کو مٹا دیتا ہے اور جمہوری نظام انفرادی وجود کے احساس کو معدوم نہیں کرتا، حالانکہ جماعتیں افراد ہی سے بنتی ہیں اور بے حوصلہ و بے امید افراد سے جو جماعت طیار ہوگی وہ بھی بے حوصلہ ہی رہے گی، حالانکہ انسانی ترقی کا راز یہی ہے کہ فرداً فرداً کچھ امنگیں ہر دل میں پائی جائیں، اور انھیں کے پورا کرنے کی سعی و کاوش بنیاد ہے انسانی ترقی کی۔

آپ اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو روس کیوں غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اس سے قبل بھی دنیا کی بڑی بڑی مستبد حکومتوں نے ترقی کی تھی جبکہ انسان سے کوڑے مار مار کر غلاموں Galley Slaves کی طرح کام لیا جاتا تھا اور اگر آج روس انسان کو ذہنی و طبعی (بلکہ جسمانی حیثیت سے) بھی غلام رکھنے کے بعد ترقی کر رہا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے۔ اکاسرۂ عجم، جبابرۂ اتراک، عمالقۂ مصر یہاں تک کہ خود زار و قیصر کے عہد کو دیکھئے کیا وہ ان کی ترقی کا زمانہ نہ تھا، لیکن جس طرح ان تمام حکومتوں کا طنطنہ رہنے والی چیز نہ تھا، اسی طرح روس کا یہ دبدبہ بھی ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے اپنے نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہ کی اور انسان کی انفرادی آزادی کو بحال نہ کیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ روس کی انفرادی جد و جہد اجتماعی سعی و عمل میں تبدیل ہو گئی ہے، اور وہاں اب جبر و غلامی کا کوئی سوال نہیں، لیکن یہ تکذیب ہوگی فطرت انسانی کی، واقعات و حقایق کی اور خود انسانی نفسیات کی۔ جب تک آہنی پردہ پڑا ہوا ہے، جو چاہے کہہ لیجئے، لیکن جس وقت یہ ہٹا تو پتہ چلے گا کہ

یاراں دگیرے رای پرستند

جمہوری نظام حکومت اس لحاظ سے یقیناً قابل تعریف ہے کہ اس نے انسان کے انفرادی میلانات چھین کر اس کو بے امید نہیں بنا دیا ہے اور نہ وہ عوامل فطرت کی ملکیت کا مدعی ہے، لیکن "ملکیت" اور تقسیم دولت کا سوال بلند و وسیع سطح پر وہ اب تک حل نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا کی کوئی جمہوریت ایسی نہیں جو اندرونی طور پر سرمایہ دار و شراف کی محکوم نہ ہو اور عوام کا لانعام نہ ہوں۔

امریکہ کتنی عظیم الشان جمہوریت ہے لیکن اس کا سر رشتہ ہاتھ میں ہے یہودی سرمایہ داروں کے، برطانیہ کتنی قدیم جمہوریت ہے لیکن شاہ پرستی و اشراف پرستی کی بنا پر لندن کی مشرقی و مغربی آبادی میں اب تک زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

پھر سوچئے ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ دولت و حکومت کا تصور ہی ان کے یہاں سرے سے غلط ہے "قوم کی حکومت قوم کے لئے" یہ ہے جمہوریت کا دعوائے بلند بانگ اور بظاہر بہت خوب اور بلند و پاکیزہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ بڑا ناقص نظریہ ہے اس نظریہ کے تحت دنیا کبھی امن و سکون کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ اس کی بنیاد ہی قایم ہے تفریق قومی پر، تفریق اغراض پر، تفریق عوامل پر اور جذبۂ مسابقت پر!

اس لئے جمہوریت محدود قومی نظریہ کے لحاظ سے چاہے کچھ ہو، لیکن وسیع انسانی مفاد اور عالمی رشتۂ انسانیت کے پیش نظر وہ کچھ نہیں ۔ پھر یہاں میں دوبارہ اس بات کا اعادہ کروں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ بہترین نظام حکومت وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا اور ہم آیندہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور بتائیں گے کہ ایک عالمی حکومت کا نظام جس کا خواب ہمارے فلاسفہ عرصہ سے دیکھ رہے ہیں، صرف اسلام ہی کی تعلیم پر استوار ہو سکتا ہے جو تمام ملکی قومی، قبایلی، نسلی و ذہنی اختلافات کو مٹا کر جملہ نوع انسانی کو ایک نگاہ سے دیکھتی ہے اور جس نے جملہ اختلافات مٹا دینے کے لئے حکومت کا وہ تصور قایم کیا جس سے زیادہ بلند تصور ممکن ہی نہیں :- الحکم للہ والملک للہ!

---

(۳)

پس منظر یا پسِ منظر

(جناب جلیل الرحمان ۔ اعظم گڈھ)

آپ کے نزدیک پس منظر لکھنا صحیح ہے یا پسِ منظر۔ امید ہے آپ اپنی رائے کے ساتھ اس کے دلایل بھی پیش کریں گے۔

(نگار) پس فارسی کا لفظ ہے جو تعقیب زمانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کا مفہوم اردو میں پھر، اس کے بعد اور پیچھے سے ادا ہو سکتا ہے جیسے "اول من آمدم پس تو آمدی" (پہلے میں آیا پھر اس کے بعد تو آیا)

اسی طرح اظہار نتیجہ کے لئے بھی پس استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ نتیجہ بھی بعد کی چیز ہے۔ یہ لفظ فارسی میں فک اضافت کے ساتھ زیادہ مستعمل ہے، جیسے پسِ دیوار۔ پسِ چمن۔ پس ان میں مضاف ہے اور دیوار و چمن مضاف الیہ، لیکن علامت اضافت (زیر) حذف کر دی ہے، مثلاً :-

بخندد غنچۂ در باغ عاشق تا کہ بنشیند
ز تنگی یک تبسم دار پس دیوار باغ او

چو دور در نظر آمد در وصال مرا
دواند عشق بہ پس کوچۂ خیال مرا

اسی طرح آیندہ پرستوں کے لئے پس فردا (فک اضافت کے ساتھ) کہیں گے :-

حسن آخر چرا اندیشی امروز
ازاں فردا کہ پس فردا ندارد

جب اس سے اسم فاعل و اسم مفعول ترکیب دیں گے تو بھی پس کا سین ساکن رہے گا جیسے پس افتادہ۔ پس انداز۔ پس اندیش

(گزشتہ بات کو سوچنے والا) پس رو۔ ظرفِ زمانی کے ساتھ بھی پس بہ سکون سین استعمال ہوگا جیسے پس انگاہ (بہ معنی بعد ازاں) کہیں گے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حرکت اضافت کے ساتھ اس کا استعمال درست نہیں۔ آپ پس دیوار کی جگہ پسِ دیوار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب رہا لفظ پس منظر سو یہ یقیناً سکون سین کے ساتھ استعمال ہوگا اور پسِ منظر کہنا صحیح نہیں، حالانکہ اس وقت بڑے بڑے شعراء و ادیب بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پس منظر کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ ہے انگریزی لفظ Background کا جو در اصل تصویر کشی یا نقاشی کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہوتی ہے تصویر کا وہ منظر جو دور نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک نقاش شیر کی تصویر بناتا ہے جو ہم سے قریب ہے اور اصل چیز ہے، لیکن اس کے پیچھے دور وہ جنگل یا پہاڑ بھی دکھاتا ہے اور یہی اس تصویر کا Background ہے جس کا ترجمہ پس منظر کیا جاتا ہے۔

اس لئے اگر آپ نے اس کو پسِ منظر کہدیا تو مفہوم بدل جائے گا کیونکہ محض لفظ منظر کے مفہوم میں تو شیر، جنگل اور سارا سین شامل ہے اور اس کی پشت پر آپ کو صرف سادہ کاغذ نظر آئے گا۔

علاوہ اس کے انگریزی میں Background صرف تصویر ہی کے لئے مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازاً سبب یا بنیاد کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے Psychological Bacground, Aesthetical B - Ethical B. Logical B. وغیرہ وغیرہ کہ ان الفاظ کے ترجمہ میں نقش یا تصویر کا تصور بھی ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور اگر ان کا ترجمہ نفسیاتی پس منظر۔ منطقی پس منظر۔ اخلاقی پس منظر۔ جمالیاتی پس منظر کیا گیا تو ان میں پس کا سین ہمیشہ ساکن ہی ہے گا اور علامت اضافت (زیر) ظاہر کرنے کے بعد ترجمہ بالکل غلط ہو جائے گا۔

اسی لئے میں ہمیشہ پس منظر لکھتا ہوں اور اگر کسی ادیب و شاعر کی زبان سے پسِ منظر سنتا ہوں تو ٹوک دیتا ہوں۔

۳

محمود و ایاز کی محبت کا راز

(سید فضل الٰہی صاحب - برہانپور)

محمود غزنوی کا عشق اپنے غلام ایاز کے ساتھ بڑی مشہور بات ہے اور اس تعلق محبت کے بارے میں بہت سے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ راز اب تک نہیں کھلا کہ محمود کو ایاز سے کیوں اتنی والہانہ محبت تھی، کیا اس کا تعلق صرف امرد پرستی سے متعلق تھا یا اس کا سبب کوئی اور بھی تھا۔

(نگار) اب تو خیر زمانہ ہی بدل گیا ہے، لیکن میرے اوائل عمر میں جب لڑکوں کو سب سے پہلے فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی تو وہ زیادہ تر ادب اور تخئیلی لٹریچر سے تعلق رکھتی تھی اور اس نوع کے لٹریچر میں شعراء فارسی کا کلام بھی سامنے آتا تھا۔

چنانچہ جب میری فارسی تعلیم شروع ہوئی تو مجھے بھی اسی منزل سے گزرنا پڑا اور اسی دوران میں محمود نامہ بھی میری نگاہ سے گزرا۔ مجھے خیال ہے کہ اس وقت میرے کسی استاد نے غالباً یہ بھی مجھ سے کہا تھا کہ محمود نامہ ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو محمود

نے ایاز کی محبت میں کہی تھیں --- اس دیوان کا پہلا شعر:

اے داغ بر دل از غمِ خالِ تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

مجھے اب تک یاد ہے اور اسی ذہنی تصور کے ساتھ یاد ہے کہ اس شعر کا مخاطب ایاز ہے۔

ایاز کے وجود سے تو انکار ممکن نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ محمود کو اس سے بڑا لگاؤ تھا، لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اس کا تعلق جذبۂ امرد پرستی سے تھا، کیونکہ ہم کو تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ محمود اس ذوق کا انسان تھا اور ایاز سے اس کی محبت اسی نوعیت کی تھی۔

ایاز بڑا مہذب و شائستہ، حد درجہ مطیع و فرمانبردار خادم تھا اور محمود کے دربار میں اس کی عزت کا سبب اس کی یہی خصوصیات تھیں، اس سلسلہ میں متعدد روایات ایاز کی اطاعت و فرمانبرداری کی بیان کی جاتی ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی کہ جب محمود کو معلوم ہوا اس کے بعض امراء دربار بھی ایاز سے حسد رکھتے ہیں تو اس نے ایک دن برسرِ دربار جب تمام سردار اور خدام جمع تھے ایک نہایت بیش قیمت موتی ہاتھ میں لے کر حکم دیا کہ اس کو توڑ کر چور چور کر دیا جائے، لیکن نہ کوئی امیر اس کی جرأت کر سکا نہ کوئی خادم، کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ مبادا بعد کو محمود بازپرس کرے کہ کیوں ایسا کیا گیا۔ جب محمود نے سب کو پس و پیش کرتے ہوئے پایا تو ایاز کو بلا کر یہی حکم دیا اور اس نے اسی وقت موتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ محمود نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ میں ایاز سے اسی لئے محبت کرتا ہوں کہ وہ میرے حکم کا بندہ ہے اور میرے فرمان کی تعمیل میں خواہ وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، پس و پیش نہیں کرتا۔

ہو سکتا ہے یہ روایت درست نہ ہو لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ محمود، ایاز کا کیوں اس قدر گرویدہ تھا، ایک اور مشہور روایت محمود و ایاز کے تعلق کے سلسلہ میں یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک رات محمود نے نشۂ شراب میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں، صبح جب ہوش آیا تو اسے بہت افسوس ہوا کیونکہ اس سے ایاز کا حُسن کم ہو گیا تھا اور اسی اضمحلال کے عالم میں وہ دربار آیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ اس افسردگی کا کوئی خاص سبب ہے لیکن کس میں ہمت تھی کہ پوچھتا، آخر کار محمود نے عنصری کو بلایا جو اس کا بڑا محبوب شاعر تھا اور اس سے سارا حال بیان کیا۔ عنصری نے اسی وقت یہ رباعی کہہ کر محمود کی افسردگی کو دور کر دیا:-

کے عیب سرِ زلفِ بت از کاستن ست | چہ جائے بغم نشستن و خاستن ست
بروزِ طرب و نشاط و مے خواستن ست | کا راستن سرو زپیراستن ست

(یعنی اگر محبوب کی زلف کاٹ دی گئی تو اس میں کیا بُرائی ہے اور کیوں اس پر افسوس کیا جائے، جبکہ سرو کا درخت کاٹ چھانٹ کے بعد اور زیادہ سجیلا ہو جاتا ہے)

اس روایت سے ضرور یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود کو ایاز کے ساتھ کچھ جمالیاتی لگاؤ بھی تھا، لیکن کسی جنسی جذبہ سے اسے متعلق کرنا درست نہیں۔ کیونکہ جہاں تک اس خاص جذبہ کا تعلق ہے وہ ایاز سے نہیں بلکہ ایاز کی بہن سے متعلق تھا اور محمود، ایاز سے نہ صرف اس لئے محبت کرتا تھا کہ وہ حد درجہ فرمانبردار خادم تھا بلکہ اس لئے بھی وہ اس کی محبوبہ کا بھائی تھا --- اس واقعہ کو محمد عوفی[1] نے اپنی کتاب جامع الحکایات

---

[1] عبدالرحمان بن عوف کی اولاد میں سے تھا اور اسی لئے اپنے آپ کو عوفی لکھتا تھا۔ اس کا سن ولادت معلوم نہیں، لیکن یقینی طور پر معلوم ہے کہ اسکی عمر کا ابتدائی حصہ بخارا و خراسان میں گزرا اور مغلوں کے حملہ کے وقت یہ ہندوستان آیا۔ یہاں سب سے پہلے وہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں پہونچا اور اسکے وزیر عین الملک حسین الاشعری کی فرمائش پر "لباب الالباب" کے نام سے فارسی شعراء کا تذکرہ مرتب کیا (جو فارسی کا قدیم ترین تذکرہ ہے)۔ قباچہ کی وفات (۶۲۵ھ) کے بعد سلطان التمش کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور "جامع الحکایات" کو پورا کیا۔ اس کے بعد دہلی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔ "محمود کو ایاز کی بہن سے جو بڑی حسین جمیل تھی، محبت ہوگئی لیکن اپنے مرتبۂ شاہی کے پیشِ نظر وہ اس کا اظہار نہ کرسکتا تھا کہ مبادا لوگ اس پر طعن کریں۔ اس کا یہ جذبۂ محبت بڑھتا رہا اور ایک دن اس نے مجبور ہوکر اپنے ایک امیر ابونصر مشکانی سے سارا حال بیان کردیا جو محمود کا بڑا مزاجداں امیر تھا۔

مشکانی نے عرض کیا کہ اس کو شریکِ زندگی بنانے میں کیا امر مانع ہے، محمود نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو دوسرے ملکوں کے سلاطین بدنام کریں گے اور خود میری رعایا پر بھی اس کا اچھا اثر نہ ہوگا، لوگ کہیں گے کہ بادشاہ نے اپنے مرتبہ سے ہٹ کر ایک خادم کی بہن سے شادی کرلی۔

مشکانی نے یہ سن کر کہا کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، اکثر شاہانِ عجم نے کنیزوں سے شادیاں کی ہیں۔ نوشیروانِ عادل ایک معمولی دہقانی لڑکی ہی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور بہرام گور نے بھی ایک ماہی گیر کی لڑکی پر عاشق ہوکر اس سے شادی کرلی تھی، محمود نے ان واقعات کی تفصیل دریافت کی تو مشکانی نے ان کو بیان کرنا شروع کیا اور بہرام گور کے واقعۂ شادی کی تفصیل سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس کی فکر دور ہوگئی اور اس نے ایاز کی بہن سے شادی کرلی۔

ان حالات کی بنا پر ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ ایاز سے محمود کی محبت کا کیا راز تھا۔

---

(۵)

فردوسی کا ایک شعر

دو مہینے اس طرف کی بات ہے کہ پاکستان کے کسی صاحب نے مجھ سے فردوسی کے ایک شعر کا مطلب دریافت کیا تھا، لیکن وہ خط گم ہوگیا اور یہ بات میرے ذہن سے جاتی رہی۔ اب یاد آنے پر تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ شعر یہ ہے:۔

کفِ شاہِ محمود عالی تبار   نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

(نگار) یہ شعر فردوسی کے ان اشعار میں سے ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمود کے ہجو میں اس نے لکھے تھے۔ اس شعر میں اس نے محمود کے بخل کا ذکر معمہ کی صورت میں کیا ہے۔

"نہ اندر نہ" سے مراد ۹ × ۹ ہے جو برابر ہے ۸۱ کے، اسی طرح "سہ اندر چہار" سے مراد ہے ۳ × ۴، جو برابر ہے ۱۲ کے اور ۸۱ × ۱۲ مل کر ۹۳ ہوتے ہیں۔

ایک طریقہ شمار کا عقد انامل بھی ہے یعنی انگلیوں کے کھولنے بند کرنے سے کسی عدد کو ظاہر کرنا۔ اور اس شعر میں اسی طریق شمار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طریق شمار کے مطابق ۹۳ کو اس طرح ظاہر کریں گے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ہتیلی کی طرف موڑ کر انگوٹھے کے نیچے لے جائیں اور یہی صورت مٹھی بند کرنے کی ہوتی ہے۔۔۔ اس لئے فردوسی یہ کہنا چاہتا ہے کہ محمود کی مٹھی ہمیشہ بند رہتی ہے اور وہ بڑا بخیل ہے۔

اس نظم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ الحاقی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مزید تصدیق اس شعر سے بھی ہوتی ہے کیونکہ فردوسی بھی ایسا ہر شعر نہیں کہہ سکتا تھا جو لایعنی معمہ کے سوا کچھ نہیں۔

باب الانتقاد

"مستحصلات الجفر"

ایک سال سے زیادہ زمانہ گزرا جب پاکستان کے ایک بزرگ جناب سید سرفراز علی رضوی نے یہ کتاب مجھے تبصرہ کے لئے روانہ کی تھی۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے علم جفر سے متعلق ہے۔ جس وقت یہ تصنیف مجھے ملی تو میں نے اسے علحدہ رکھ لیا، کیونکہ مجھے خود اس قسم کے علوم سے جو مبہمات سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، خصوصیت کے ساتھ علم جفر، جس سے والد مرحوم کو بھی کافی شغف تھا اور ان کے بعض احباب کو بھی۔ میں اپنے بچپن میں ان بزرگوں کے پاس بیٹھ کر ان کے استخراجات احکام کے طریقہ کو دیکھا کرتا تھا گو سمجھ نہ سکتا تھا۔

اب ایک زمانہ کے بعد سید سرفراز علی صاحب رضوی کی جو یہ کتاب سامنے آئی تو تمام غیر شعوری نقوش جو اب سے ۶۰ سال قبل دماغ میں منقوش ہو چکے تھے، پھر ابھر آئے اور میں نے فرصت کے اوقات میں اس پر غور کرنا شروع کیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اس کتاب کے تمام طرق استخراج نتائج کو سمجھ لیا، تو یہ کہنا بالکل غلط ہوگا، لیکن اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس فن پر اردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جس کو غور کرنے کے بعد سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے بتائے ہوئے قواعد پر عمل کر کے ہم استخراج نتائج بھی کر سکتے ہیں اور لوگوں کے سوالات کا جواب بھی دے سکتے ہیں۔

اس کتاب میں متعدد اصول بتائے گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ آسان طریقہ وہ ہے جسے مستحصلہ کدہ کہتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ وہ زیادہ دقیق و مشکل نہیں۔ لیکن باوجود بار بار کوشش کے میں اسے پوری طرح نہیں سمجھ سکا، مختلف سوالات قایم کر کے ان کا جواب حاصل کرنا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ مثلاً جو سوالات قایم کر کے انھوں نے جس طرح استخراج جواب کیا تھا وہ بھی میرے لئے اب بھی ناقابل فہم تھا۔

میں نے ان کو ایک سوال بھیجا (جس کے اظہار کی ضرورت نہیں) اور انھوں نے اس کا جواب مع طریق عمل کے مجھے دیا، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا سوال روانہ کیا اور ان کا بھی انھوں نے جواب دیا، لیکن ان میں سے پہلے دو سوال ایسے تھے جن کا تعلق مستقبل سے ہے اس لئے ان کی صحت و عدم صحت کا علم ابھی نہیں ہو سکتا۔ آخری سوال جو میں نے اپنے لڑکے کی کامیابی امتحان کے متعلق بھیجا تھا اس کا جواب البتہ انھوں نے بالکل صحیح دیا۔

اس کے بعد میں نے انھیں لکھا کہ میں پاکستان آرہا ہوں اور وہیں بالمشافہ ان سے اس فن کے نکات و رموز کو سمجھوں گا چنانچہ سال گزشتہ جب میں کراچی پہونچا تو وہ ازراہ کرم تشریف لائے اور متعدد صحبتوں میں میں نے اس کتاب کو ان سے سمجھا۔ اس زمانہ میں بعض اور سوالات بھی ان سے کئے جن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "عالمی جنگ ہوگی یا نہیں اور ہوگی تو کب تک" تو اس کا جواب یہ نکلا کہ "عالمی جنگ ہوگی اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین برس میں"۔ ان کا یہ جواب صحیح ہے یا غلط اس کا حال بھی ابھی نہیں معلوم ہو سکتا۔ اگر اس وقت تک زندہ رہا تو جان لوں گا، لیکن اس سلسلہ میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ سید صاحب نے صرف

جفر بلکہ رمل و نجوم کے بھی ماہر ہیں اور ان کے اوقات کا اکثر حصہ انھیں علوم کی چھان بین اور لوگوں کے سوالات کا جواب دینے میں صرف ہوتا ہے۔

یہ کتاب موصوف سے تین روپیہ میں مل سکتی ہے۔ پتہ یہ ہے:-
سید سرفراز علی رضوی۔ محلہ رسول آباد۔ مکان نمبر $\frac{D9}{13}$ ۔ فقیر محمد خاں درّا روڈ۔ کراچی۔

یہاں تک تو خیر ذکر تھا صرف اس مخصوص کتاب اور اس کے فاضل مصنف کا لیکن نامناسب نہ ہوگا اگر تاریخی حیثیت سے بھی اس فن پر نگاہ ڈال لی جائے۔

علم جفر کے متعلق بعض شیعی فرقوں کا خیال ہے کہ وہ ایک الہامی علم ہے جو حضرت علی کو حاصل تھا اور بعد کو ان کے جانشینوں میں منتقل ہوتا رہا۔ اصل بنیادی عقیدہ اس باب میں یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی کو ایک صحیفہ ایسا مرحمت ہوا تھا جو قرآن پاک کے حقیقی و روحانی مفہوم کا حامل تھا اور سینہ بسینہ ائمۂ معصومین کو منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب وہ امام جعفر صادق (چھٹے شیعی امام) تک پہونچا تو انھوں نے اس کی بنیاد پر ایک کتاب تصنیف کی جو بکری کی کھال پر مرقوم تھی (عربی میں بکری کے بچّہ کو جفر کہتے ہیں اس لئے اس کا نام کتاب الجفر ہوگیا) کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی وساطت سے تمام آیندہ و گزشتہ حالات معلوم ہوسکتے تھے۔

ابن قتیبہ کے حوالہ سے دمیری کی کتاب الحیوان میں بے شک امام جعفر صادق کی اس کتاب کا حوالہ ملتا ہے، لیکن کتاب الحیوان کے اولین مخطوطہ میں اس کا ذکر موجود نہیں اور ابن ندیم نے بھی اپنی کتاب الفہرست میں کتاب جفر کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس نے امام محمد جعفر صادق کے حالات لکھنے میں خاص اعتناء سے کام لیا ہے۔

اس زمانہ میں اس قسم کی پیشگوئیوں کا عام ذوق پیدا ہوگیا تھا جو زیادہ تر جماعت علوئین کے باقیات میں رائج تھا اور اس نوع کی کتب ملاحم (علم الہامی) وجود میں آگئی تھیں (جیسے علی بن یقطین کی کتاب الملاحم) اور انھیں میں سے ایک کتاب الجفر بھی ہے جو امام جعفر صادق سے منسوب کی جاتی ہے۔

اہل سنت، خارجی اور معتزلہ، ایسی کتابوں یا ایسے علوم ملہمہ کے قایل نہیں، لیکن شیعی حضرات اب تک ان پر یقین رکھتے ہیں اور علم جفر کو امام جعفر صادق کی یادگار سمجھ کر اس پر بڑا اعتماد رکھتے ہیں۔ امام جعفر صادق کو زمانۂ آیندہ کا کتنا علم حاصل تھا اس کا اندازہ ایک شیعی مصنف کی روایت سے ہوسکتا ہے کہ جب مامون نے امام علی بن موسی الرضا کو اپنا جانشین نامزد کیا تو امام نے کہا کہ جفر اور جامعہ دونوں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور آخر کار یہی ہوا کہ مامون نے (جیسا کہ مشہور ہے) زہر ملا ہوا انگور کھلا کر انھیں ہلاک کردیا۔ جامعہ بھی ایک اسی قسم کی کتاب ہے جس کا ذکر کتاب الجفر کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ایک کتاب مصحف فاطمہ کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا جاتا ہے۔

البیرونی نے بھی امام جعفر صادق کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے لیکن انکی کتاب الجفر کا حوالہ کہیں نہیں دیا۔ ابن خلدون نے البتہ ملاحم کے سلسلہ میں امام جعفر صادق کی کتاب الجفر کا ذکر ضرور کیا ہے کیونکہ وہ خود بھی ائمہ و اولیاء کی کرامت کا قایل تھا اور ایسی کتابوں پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اصل کتاب الجفر، ہارون بن سعید کے پاس موجود تھی، جسکے متعلق وہ کہتا تھا کہ مجھے امام جعفر صادق سے پہونچی ہے، اسی کے منتشر اجزاء بعد کو ملک میں پھیل گئے — اسی نام کی ایک اور کتاب کا ذکر ابن خلدون نے کیا ہے جسے یعقوب بن اسحاق الکندی نے مرتب کیا تھا جس کے ذریعہ سے وہ مسلم حکومتوں کے عروج و زوال کے زائچے طیار کرتا تھا — الغرض جفر الہام و نجوم دونوں سے تعلق رکھتا تھا جس میں حروف ابجد کے اعداد کے الٹ پھیر سے جواب حاصل کیا جاتا تھا، اور یہ علم بعد میں بھی عرصہ تک مقبول رہا، لیکن رفتہ رفتہ اس کے جاننے والے ختم ہوگئے یا اب اگر کہیں ہیں بھی تو لوگ ان سے واقف نہیں — میں خود کسی پیش گوئی یا اخبار عن الغیب کا قایل نہیں اور نجوم کے زیر ظہور واقعات کو بھی تسلیم نہیں کرتا، لیکن جفر کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کو اونچی ریاضی یا علم الحساب کی حیثیت ضرور حاصل ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اعداد کے الٹ پھیر سے بعض عجیب و غریب باتیں سامنے آتی ہیں، جن کی علمی توجیہ کی دشواریوں میں پڑنے کے بجائے یہ زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غیبی اشارات سمجھ لیا جائے۔

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا

سلکی پلین

جورجیٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
نائلن
نٹون

کپڑا

سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لنن
شنٹون

کپڑا

اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پانامہ
پرشیا

ان کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹیڈ جی۔ٹی روڈ۔ امرتسر

ٹیلیفون 2562　　تار کا پتہ :- "رین" (...yon.)

ایجنٹ :- ٹراونکور رین لمیٹیڈ - برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

فکاہات

(اڈیٹر)

عذرِ گناہ بدتر از گناہ یہ مقولہ فارسی کی طرح عربی میں بھی بہت مقبول ہے۔ چنانچہ ایک بار "ہارون الرشید" نے اپنے محبوب شاعر ابونواس سے پوچھا کہ "گناہ کی معذرت تو اچھی بات ہے، وہ کیونکر گناہ سے بدتر ہو سکتی ہے"۔

ابونواس نے عرض کیا "حضور، میں اس کا جواب سوچ کر پھر کسی وقت دوں گا" — اسی دن شام کو وہ محل خانۂ خلافت کی ڈیوڑھی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور جب دھندلکے میں خلیفہ اندر جانے لگے تو ابونواس نے آگے بڑھ کر ان کا منھ چوم لیا۔

ہارون الرشید نے سخت غضبناک ہو کر پوچھا "یہ کیا حرکت تھی" — اس نے جواب دیا کہ "امیر المومنین، معافی چاہتا ہوں، میں نے غلطی سے آپ کو زبیدہ خاتون سمجھ لیا تھا"۔

جب یہ جواب سُن کر ہارون الرشید اور زیادہ برہم ہوا تو ابونواس بولا "پیر و مرشد عذرِ گناہ بدتر از گناہ اسی کو کہتے ہیں"۔

قیمتی فریب دوسری جنگ عظیم کے دوران میں (۱۹۴۲ء) ایک فوجی جنرل برٹنز اسکول کے دفتر میں آیا اور پرنسپل سے کہا کہ "کیا چھ ہفتے میں ۰۰ سپاہیوں کو ناروے کی زبان سکھا دینے کا انتظام آپ کر سکتے ہیں"۔ — اس نے کہا کہ: "اگر امریکہ کے تمام اساتذہ جو ناروے زبان کے ماہر ہیں اکٹھا ہو جائیں تو ایسا ہونا ممکن ہے"۔

چنانچہ یہ تمام اساتذہ طلب کئے گئے اور سپاہیوں کو ناروے کی زبان سکھائی جانے لگی، لیکن اسی کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ دوسرے طلبہ اس راز سے واقف نہ ہوں۔ چھ ہفتہ کے بعد جب وہ یہ زبان سیکھ گئے تو انھیں انگلستان بھیج دیا گیا اور وہاں انھیں ٹھنڈے ملک کی وردی بھی تقسیم کر دی گئی، لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھیں معلوم ہوا کہ انھیں افریقہ بھیجا جا رہا ہے

بعد میں راز کھلا کہ یہ سب کچھ جرمنی کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ وہ اپنی توجہ ناروے کی طرف مبذول رکھے اور افریقہ کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہو۔

آرٹ اور کلچر ایک فرانسیسی آرٹسٹ کا دیوالہ نکلا تو اس نے اپنے تصویر خانہ کی تمام بیش قیمت تصاویر بیچنا شروع کر دیں، لیکن اپنے آبدار خانہ کو بالکل محفوظ رکھا اور شراب کی ایک بوتل بھی علحدہ نہیں کی۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ "تم نے ایسا کیوں کیا۔ تصویریں تو زیادہ قیمتی چیزیں تھیں" — اس نے جواب دیا کہ "انسان آرٹ کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے، لیکن کلچر کھو کر جینے کے کوئی معنی نہیں"۔

عجیب اتفاق ولایت میں کسی وقت جمعہ (Friday) کا دن بہت منحوس دن خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ اس وہم کو دور کرنے کے لئے ایک جہاز کی تعمیر اسی دن شروع کی گئی، اس کا نام بھی یہی رکھا گیا، اسی دن وہ سمندر میں ڈالا گیا اور اسی دن اس نے اپنا سفر اختیار کیا۔ لیکن اسکے بعد اسے لوٹنا نصیب نہ ہوا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ زمین کھا گئی یا آسمان!۔

INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING

the knitting wool made by man

INTRODUCING

....with woman in mind

INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING
INTRODUCING

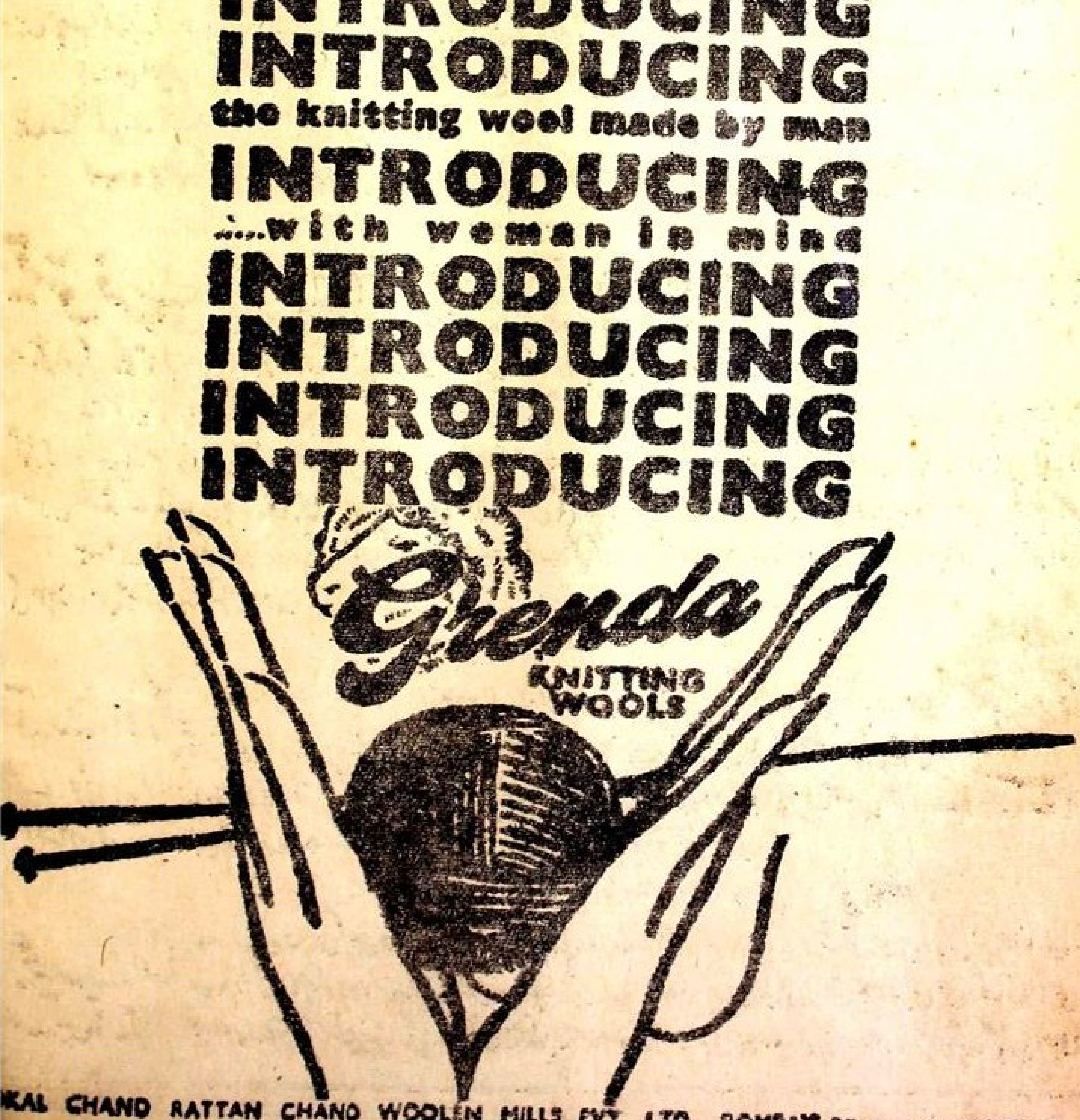

KAL CHAND RATTAN CHAND WOOLEN MILLS PVT. LTD., BOMBAY, DELHI AND AMRITSAR

انتخاب

امجد نجمی - کٹک

ہے وہی کیفیت بے تابئ موجِ نظر / حسن کے جلووں کو بحرِ بے کراں پاتا ہوں میں

اے نظامِ دار و مقتل گوش بر آواز ہو / اب زباں پر اپنی حرفِ مدعا لاتا ہوں میں

تم جلوہ دکھاؤ تو ذرا پردۂ در سے / ہم تھک گئے نظارۂ خورشید و قمر سے

اس کا ہر ہر گھونٹ تھا زہرِ ہلاہل سے سوا / زندگی کو چشمۂ آبِ بقا سمجھا تھا میں

یہاں تو قابلِ افسوس ہیں دشواریاں ان کی / تمھاری راہ میں مشکل کو جو مشکل سمجھتے ہیں

کب بھلا چھوڑا ہے ہم سے کارواں والوں کا ساتھ / ہم بھٹک کر بھی غبارِ کارواں تک آ گئے

میں سعئ مسلسل کر کے بھی منزل سے کوسوں دور رہا / منزل نہ ملی تو کیا ہے مگر اپنے کو پاتا جاتا ہوں

ہم فریبِ ہستئ موہوم یوں کھاتے رہے / جو نہ کرنا تھا وہ کرتے اور پچھتاتے رہے

کچھ اپنے آپ کو ایسا مٹا رہا ہوں میں / کہ جس کو پاتا تھا اب اس کو پا رہا ہوں میں

مرے مشرب میں سجدہ بت کا گو جایز نہیں لیکن / تراشا ہے تجھے جس نے میں قایل ہوں اس آذر کا

حسنِ دلکش کا بھی کیا انداز ہے / ناز گویا ہے ادا خاموش ہے

ان کی مے اور ان کا مینا، میرا کام تھا پیتے رہنا / کچھ بھی نہ تھا اندیشۂ فردا، رات گئی وہ بات گئی

تقدیر کے ہم قایل ہی نہ تھے، پر اتنا کہنا پڑتا ہے / تدبیر کا دامن ہاتھ میں اپنے آکر اکثر چھوٹ گیا

جھکتا ہی نہ تھا پر ایسا جھکا نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں / معلوم نہیں اس سر نے کیا، اس سنگِ در میں دیکھ لیا

محبت کا دریا، جوانی کی لہریں / یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

یہ ان کی جدائی، یہ ساون کی جھڑیاں / بس آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے،

یہ جان تو دینے ہی کی اک چیز ہے لیکن / میں ان کا تقاضائے وفا دیکھ رہا ہوں

مرے حسنِ طلب کو دیکھ نجمی، / کہ لب پر خامشی ہی خامشی ہے

نجمی یہ خموشی بھی میری کچھ وجہ سکونِ دل نہ ہوئی / میں ضبطِ فغاں سے درد کو اپنے اور بڑھاتا جاتا ہوں

پہونچا دیا ہے مجھ کو مرے عشق نے وہاں / جس جلوہ گاہِ ناز میں سجدہ روا نہیں

اکرم دھولیوی

گر پڑی ایک برق سی دل پر / جب نشیمن قفس میں یاد آیا

پردۂ ناز تو اٹھا لیکن، / دل کی بے تابیوں پہ حرف آیا

ترکِ الفت پہ جب نگاہ گئی / عشق مجبور ہی نظر آیا

چھیڑ کر آج درد کی روداد / ہم بھی تڑپے انھیں بھی تڑپایا

انتخاب

(درد سعیدی)

اپنی منزل سے مایوس ہم ہو گئے
فاصلے راہ کے یوں بھی کم ہو گئے

ہم اُن سے کہیں ملے ہیں، لیکن
کچھ یاد نہیں کہاں ملے ہیں

محرومیٔ دل کا ہے یہ عالم!
اب سجدۂ شکر بھی گلے ہیں

اتنے بھی قریب سے نہ گزرو!
دل چونک پڑے نظر سے پہلے،

پہچان سکو گے اب مجھے کیا
میں اپنے لئے بھی اجنبی ہوں

سمجھا ہوں قفس کو آشیانہ
زندانیٔ رسمِ زندگی ہوں

موج و طوفاں سے کیا گلہ کرتے
ہم سفینوں میں غرقِ آب ہوئے

رہ گئیں بیشتر جنوں بن کر
کوششیں اُن کو بھول جانے کی

کبھی فریب بھی کھائے ہیں آگہی کے لئے
بھٹک گیا ہوں اندھیروں میں روشنی کیلئے

(جمیلؔ مظہری)

آستیں میری ہے اور دیدۂ تر ہے اے دوست
اب مرے اشک کا قطرہ بھی گہر ہے اے دوست

یہ نہ دیکھا کہ تبسم کی تہوں میں کیا ہے
کس قدر کور، محبت کی نظر ہے اے دوست

دِل تھا محتاط تو در بھی نظر آیا دیوار،
دِل ہے بیتاب تو دیوار بھی در ہے اے دوست

عقل اور عشق میں مدت سے ہے گو کشاکش
میرا دل ہے کہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے اے دوست

ہو نہ زحمت تو اُچٹتی سی نظر سوئے جمیلؔ
یہ گداسائلِ یک زخمِ جگر ہے اے دوست

(ڈاکٹر متینؔ نیازی)

کیفِ تصور اللہ اللہ،
جلوے پر ہیں جلوے چھائے

لوگ مجھی کو سمجھاتے ہیں،
کوئی اُن کو بھی سمجھائے

بیٹھے ہوئے ہیں تیرے وحشی
راہگذر میں آنکھیں بچھائے

بازیٔ الفت ایک معمہ،
جیت یہی ہے ہارا جائے

آپ تھے، میں تھا، کیا عالم تھا،
لوٹ کے وہ لمحات نہ آئے

پھول کھِلے بھی مرجھائے بھی،
دُنیا بدلی، آپ نہ آئے

اول اول اپنے بسمل پر تھے پیہم قہقہے
آخر آخر اُن کے دل میں بھی ملال آ ہی گیا

پاسِ خودداری سے میں غافل نہ تھا لیکن متینؔ
اضطرابِ شوق میں لب پر سوال آ ہی گیا

کرم جو حد سے سوا ہو تو ہے عذاب اے دوست
بہ قدرِ ضبط ہی منظور ہے عتاب اے دوست

(شفقت کاظمی)

یاد آئے ہیں دوستوں کے میلے — جب پھول چمن چمن کھلے ہیں
یہ رنج یہ درد بے کسی کے — شاید ترے پیار کے صلے ہیں
اس طرح چھٹی کہ پھر نہ آئی — ہم کو تیری یاد سے گلے ہیں
گزرے ہیں نظر بچا کے شفقت
وہ راہ میں جب کبھی ملے ہیں

بارِ گلشن تھا جب وجود اپنا — ہم سبز شاخسار کیا کرتے
اپنے شکووں پہ خود ہوئے نادم — ہم انھیں شرمسار کیا کرتے
ہو جائیں جس گھڑی فسانہ — ڈھونڈھے گا بہت ہمیں زمانہ
ہمراہ ابھی جو چل رہے تھے — کیا جانے کدھر ہوئے روانہ
ملتے ہی بچھڑ گئے وہ ہم سے — ترتیب نہ پا سکا فسانہ
کیوں تم نے کہی وہ بات شفقت
جس کو نہ سمجھ سکا فسانہ

انڈین نیشنل ببلوگرافی

انڈین نیشنل ببلوگرافی حالیہ ہندوستانی مطبوعات کا مستند ریکارڈ ہے۔
تاریخ میں پہلی بار، انگریزی اور دیگر مندرجہ ذیل زبانوں کی تمام مطبوعات کا صحیح اور مفصل ریکارڈ اب رومن رسم الخط میں دستیاب ہے
آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑ، ملیالم، ہندی، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی، سنسکرت، تلگو، اور اردو۔
پنج سالہ پلانوں کے عرصہ میں سرکار نے متعدد اہم کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ کتابیں اقتصادیات، سیاسیات اور عمرانیات کے طلباء کے لئے بنیادی مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام کتابیں بھی اس ببلوگرافی میں شامل ہیں۔

سائز:- ڈیمائی کوارٹر ۸½ × ۱۱ چھپا ہوا حصہ ۹ × ۶½
اشاعت:- چار سہ ماہی شمارے اور ایک کیلنڈر سال پر مشتمل سالانہ نمبر۔
قیمت:- سالانہ نمبر -/۵۰ روپے فی جلد، محصول ڈاک الگ۔ سہ ماہی شمارہ ۱۵ روپے ۵۰ نئے پیسے، محصول ڈاک الگ۔
رعایت:- ایک سہ ماہی شمارے کی کم سے کم چھ جلدیں اور سالانہ نمبر کی تین جلدیں بیک وقت خریدنے پر ۱۵ فی صد رعایت دی جائے گی۔
دستیابی:- پہلا شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں شایع ہوا تھا۔ پچھلے تمام شمارے چندے کی رقم ادا کر کے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ:- گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل ریفرنس لائبریری، معرفت نیشنل لائبریری، بل وے ڈر، کلکتہ نمبر ۲۷

مطبوعات موصولہ

نمونہ لغات اُردو ترقی اُردو بورڈ کراچی نے حال ہی میں ایک نمونہ اس لُغت کا شایع کیا ہے جو وہاں زیرِ ترتیب ہے - یہ نمونہ صرف طلب رائے کے لئے شایع کیا گیا ہے اور گو اس کی ضخامت صرف ۴۶ صفحات کی ہے، لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس لغت کی ترتیب میں کس قدر غیر معمولی تحقیق و کاوش سے کام لیا جا رہا ہے -

اُردو لُغت میں امیر اللغات کو خاص شہرت حاصل ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مکمل نہ ہو سکی - فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات بھی اچھے فرہنگ ہیں، لیکن اغلاط سے پاک نہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی لُغت اُردو کا ایسا طیار کیا جائے جو ہر لحاظ سے مستند ہو، اور خوشی کی بات ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کراچی اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے -

اس لغت کی سب سے بڑی خوبی جس کا اندازہ "نمونہ" دیکھ کر کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ محض لُغت ہی نہیں بلکہ ایک حیثیت سے دائرۃ المعارف کی بھی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اسکی یہی حیثیت قایم رہی تو یقیناً بڑی اہم خدمت ہوگی - تاہم ایک مشورہ ضرور دوں گا وہ یہ کہ الفاظ کی تخلیق و تشکیل و تعیینِ معانی کے سلسلہ میں زیادہ چھان بین کی ضرورت ہے اور قصص طلب یا تلمیحی الفاظ کے سلسلہ میں صحت روایات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے - مثلاً :-

۱- "اب" کے سلسلہ میں اس کا ایک طنزیہ مفہوم ترک ہو گیا - جیسے کوئی شخص صحیح و مناسب وقت گزرنے کے بعد پہونچے تو کہیں گے "تم اب آئے" - !

۲- "ابھی" کے سلسلہ میں "ابھی ابھی" رہ گیا -

۳- "اُپج" کے ذیل میں لفظ "اُپج" ترک کر دیا گیا - حالانکہ "اپجنا" درج ہے - (صفحہ ۸)

۴- "اصحاب" اس لغت کے سلسلہ میں اصحاب فیل، اصحاب صفہ، اصحاب الشمال، اصحاب الیمین کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن اصحاب الاخدود، اصحاب الایکہ و اصحاب الثمود وغیرہ کو ترک کر دیا - یہ درست ہے کہ یہ الفاظ اُردو نظم پر مستعمل نہیں ہوتے لیکن اُردو نثر میں تو ہوتے اور ہو سکتے ہیں -

"اصحاب کہف" کے سلسلہ میں "چند اہل ایمان" کا ذکر کیا گیا ہے لیکن وہ کس مذہب و قوم کے تھے اس کی صراحت موجود نہیں اسی طرح یہ لکھنا کہ اصحاب کہف اب تک سو رہے ہیں، عقلاً و روایتاً درست نہیں -

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنا ہے، وہ یہ کہ جن مصنفوں سے استناد کیا جائے ان کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے - ضرورت ہے کہ مزید تصدیق کے لئے دوسرے اساتذہ کی تحریروں کی بھی جستجو کی جائے اور اگر ان میں باہم اختلاف ہو تو بورڈ کو خود اپنی رائے علحدہ قایم کرنا چاہئے -

مثلاً اصیل کے سلسلہ میں ناصر نذیر فراق دہلوی کا ایک جملہ سند کے طور پر درج کیا گیا ہے :-

"نوکریں، چاکریں، اصیلیں اِدھر اُدھر ہیں" ——— اس میں اصیلیں کہنا تو درست ہے، لیکن نوکریں، چاکریں ا[بل] غور طلب ہے، کیونکہ نوکر اور چاکر دونوں مذکر ہیں، ان کی جمع نوکریں، چاکریں نہیں ہو سکتی اور بصورت تانیث نوکر کو نوکر[نی] کہیں گے -

نوائے پریشاں

جناب جگن ناتھ آزاد کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے جسے ادارۂ انیس اُردو الہ آباد نے حال ہی میں شایع کیا ہے اس مجموعہ میں نظمیں، رُباعیاں اور غزلیں سبھی کچھ ہے، لیکن ان تمام اصطلاحی اصناف سخن سے ہٹ کر ایک چیز اور بھی ہے جسے .Turned Insideout " کہتے ہیں اور یہ بات اس وقت مجھے آزاد کے کلام کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔

آزاد بڑا پڑھا لکھا شاعر ہے، لیکن اور بھی بہت سے شاعر پڑھے لکھے موجود ہیں، آزاد بڑا وسیع المطالعہ شاعر ہے مگر ایسے شاعر اور بھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، لیکن "دل چیر کر سامنے رکھ دینے والا شاعر"، کوئی نہیں۔

آزاد کی شاعری الفاظ کی رسمی شاعری نہیں، قلب و روح کی شاعری ہے اور اتنی کھل کر جذبات محسوسات سے نکل کر مرئیات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد جو کچھ کہہ رہا ہے ہم اسے دیکھ بھی رہے ہیں۔ یوں تو آزاد ایک بت گر شاعر ہے اور اس کا ہر مجموعۂ کلام ایک "بتکدہ" لیکن نوائے پریشاں غالباً اس کا سب سے بڑا بتکدہ ہے۔ اس میں شک نہیں آزاد کا کلام اُردو شاعری کا سنگھار ہے۔ قیمت ہے

شہرِ سخن

مجموعہ ہے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے انتقادی تاثرات کا جسے ملکزادہ پبلی کیشنز اعظم گڈھ نے شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں نئے پُرانے، چھوٹے بڑے ۲۶ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن سے خود مصنف کو ملنے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس لئے ہم اس کو انتقادی ڈائری بھی کہہ سکتے ہیں اور انتقادی جایزہ بھی۔ لیکن اس کی ایک تیسری خصوصیت اور بھی ہے یعنی یہ کہ وہ بجائے خود انشاء لطیف اور انشائیہ نگاری کا بھی بڑا پاکیزہ نمونہ ہے۔

ملکزادہ ابھی نوجوان ہیں اور اسی کم عمری میں ان کا اکثر شعراء سے مل لینا ظاہر کرتا ہے کہ شاید یہ تمام زحمت "دید و داد دید" انھوں نے صرف اسی لئے اختیار کی تھی کہ وہ جو کچھ لکھیں وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے تنقید کی وہ راہ اختیار کی ہے جو اس سے قبل کسی نے اختیار نہ کی تھی اور اسی لئے ہم کو اس کتاب میں بعض بڑے لطیف و اہم پہلو شخصی مطالعہ کے بھی ملتے ہیں جو کلام اور صاحبِ کلام دونوں کے سمجھنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ملک زادہ نے شعراء کے متعلق جو رائے قایم کی ہے وہ نہ صرف معتدل و متوازن بلکہ صاف و بے لاگ بھی ہے اور اگر اسے پھیلایا جائے تو وہ ایک بن سکتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت جو مجھے بہت پسند آئی، اس کا انداز بیان ہے جس میں واقعیت اور Human دونوں کو ملا کر. Essay کا رنگ پیدا کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں ملک زادہ کا یہ ادبی تجربہ بالکل پہلا تجربہ ہے جس میں چسٹرٹن، برنارڈ شا اور آسکر وائلڈ کے طنز اور Paradox کے امتزاج سے ایک نئی لیکن بڑی دلکش مثال انتقاد نگاری کی پیش کی گئی ہے ضخامت ۲۲۰ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔

شعلۂ آواز

دیوان ہے جناب سراج لکھنوی کا جو ۱۰۴ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ۴۰ غزلیں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک کی ہیں ۴۰ غزلیں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۵ء تک کی اور باقی ۲۴ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک کی۔ یہ تقسیم جناب سراج نے غالباً اس لئے مناسب سمجھی کہ ان کے مختلف زمانوں کی شاعری کا رنگ علحدہ علحدہ متعین ہو سکے، حالانکہ جب ہم ان تینوں زمانوں کی آخری غزلوں کو سامنے رکھتے ہیں تو ہم کو ان میں کوئی قابل ذکر فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ان تینوں زمانوں کی آخری غزل کا ایک ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

۱۔ قفس کا دور سہی موسمِ بہار تو ہے، اسیرو آؤ ذرا ذکرِ آشیاں ہو جائے
۲۔ اسی دن ہر گرہ کھل جائے گی اشکِ مسلسل کی ہنسی بن کر ترے ہونٹوں پہ جس دم میرا نام آیا
۳۔ مٹا سا حرف ہوں بگڑی ہوئی سی بات ہوں میں جبینِ وقت پہ اک نقشِ بے ثبات ہوں میں

ٹکنک اور اسلوب بیان ایک ہی ہے، البتہ بہ لحاظ معنی آخری شعر میں تشاؤم کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے، جو ممکن ہے نتیجہ ہو تلخ تجربات کا۔

یہ دیوان سید صدیق حسن صاحب (آئی، سی، ایس) کے پیش لفظ سے شروع ہوتا ہے جو نہ صرف موصوف کا اعتراف خلوص و محبت ہے بلکہ بعض اشعار پر صحیح نقد و تبصرہ بھی ہے، اس کے بعد خود سراج صاحب نے ایک طویل دیباچہ کی صورت میں اپنی شاعری کے نظریوں پر روشنی ڈالی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں زبان کے زیادہ قایل نہیں ہیں بلکہ تخیل و اسلوب بیان کو اصل چیز قرار دیتے ہیں اور اپنی فکر سخن میں انھوں نے انھیں دونوں کے حسن کا خاص لحاظ رکھا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"میں اپنے کلام میں تخصیص کے ساتھ خصوصیات زبان پر داد طلب نہیں ہوں اور نہ محض زبان اور محاورے کو اپنی شاعری کی سنگ بنیاد سمجھتا ہوں - میں ہمیشہ سے فکر و تخیل کا دلدادہ ہوں۔"

ان کے اس دعوے کو سامنے رکھ کر جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دعویٰ بے بنیاد نظر نہیں آتا۔ یقیناً ان کے یہاں فکر و تخیل بھی ہے اور ندرت اظہار بھی، جسے لکھنوی زبان میں "اپج" کہتے ہیں، لیکن وہ کس درجہ و معیار کی ہے، اس کے جاننے کیلئے خصوصیات زبان کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے (گو جناب سراج اسے شاعری کا سنگ بنیاد نہیں کہتے) اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس باب میں بھی وہ ایک ممتاز حیثیت کے مالک کہے جاسکتے ہیں۔

کلاسکل غزل گوئی کے نمایندوں میں اس وقت دو ہی چار حضرات رہ گئے ہیں۔ ۔ ۔ اور ان پروانوں میں سے ایک سراج صاحب بھی ہیں:- نیمۂ داغ و نیمہ خاکستر!

ان کی مشق ۵۰ سال کی ہے اور اس نصف صدی میں معلوم نہیں کتنے ہنگامے شعر و سخن کے ان کی نگاہ سے گزرے ہوں گے اور کتنی محفلوں میں دادِ سخن حاصل کی ہوگی، اس لئے یقیناً سراج کو حق پہونچتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا شمار اساتذۂ فن میں کیا جائے

سراج کے یہاں ہم کو شورش محبت کم نظر آتی ہے، اور معاملات و محاکات بھی چنداں قابل ذکر نہیں، لیکن دل کی چوٹ ان کے ہر شعر سے ظاہر ہے جو صداقت شعری کی شرط اولین ہے۔

فنی حیثیت سے یقیناً ان کا کلام بے عیب نہیں اور ان کی بعض شاعرانہ تعبیرات بھی محل نظر ہیں، لیکن چونکہ خود سراج صاحب فن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اس لئے اس کا ذکر فضول ہے۔

یہ مجموعہ پیر جی کٹڑہ ابو تراب خاں لکھنؤ کے پتہ پر مصنف سے مل سکتا ہے۔

جدید شاعری

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تازہ تالیف ہے جس میں انھوں نے جدید شاعری کے آغاز و ارتقاء اور موجودہ موقف پر نہایت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ خصوصیت کہ جب وہ کوئی بات کہنے پر آتے ہیں تو اس کا بعید ترین پہلو بھی ان سے نہیں چھوٹتا، اس تصنیف میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

ہر چند شاعری کے سلسلہ میں جدید و قدیم کی بحث بظاہر پرانے اور نئے ٹکنک کی بحث ہے، لیکن اس کا تعلق معنویت و موضوع سے بھی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

جدید شاعری پر مخالف و موافق تحریریں یوں تو بہ کثرت شایع ہوچکی ہیں لیکن اس موضوع پر کوئی مستقل تالیف اب تک سامنے نہ آئی تھی۔ اس لئے ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک بڑی ادبی ضرورت کی طرف توجہ فرمائی اور ایک ایسی بسیط و مفصل کتاب تیار کی جسے غالباً وہی لکھ سکتے تھے۔

ضخامت ۴۶۴ صفحات، طباعت، کتابت اور کاغذ نہایت پسندیدہ۔

قیمت پندرہ روپیہ ــــ ملنے کا پتہ:- اردو دنیا ــــ آرام باغ روڈ ــــ کراچی۔

نوائے گُہر مجموعہ ہے جناب بشیشر پرشاد منور لکھنوی کی غزلوں کا جسے آدرش کتاب گھر فیض گنج، دریا گنج دہلی نے شایع کیا ہے۔

منور صاحب، دُنیائے شعر و ادب میں کسی نووارد کی سی حیثیت نہیں رکھتے کہ تعارف کی ضرورت ہو۔ اب سے پچاس سال پہلے انھوں نے دیار ادب میں قدم رکھا تھا اور ابتک انھوں نے کہیں اقامت اختیار نہیں کی۔

منور صاحب، سرزمین لکھنؤ کے فرزند ہیں اور نہ صرف اپنے مزاج و کلچر بلکہ اکتسابات علمی کے لحاظ سے بھی وہ اسوقت کے انسان ہیں جبکہ زندگی نام تھا صرف شرافت نفس اور نفاست ذوق کا — اور انھیں فطری خصوصیات کے ساتھ وہ دُنیائے ادب میں آئے اور اب تک انھیں نباہے جا رہے ہیں۔

جناب منور کا طبعی رجحان زیادہ تر بیانیہ شاعری کی طرف ہے اور اسی رجحان نے انھیں گیتا، کُمار سمبھو اور کلام حافظ کے منظوم ترجموں کی طرف مایل کیا اور "کائنات اول" لکھوائی جو ان کی نظموں کا بہت مقبول مجموعہ ہے۔ اس دوران میں انھوں نے غزلیں بھی کہیں لیکن ان کی اشاعت کو ہمیشہ "وقت دگر" پر ملتوی رکھا، شاید اس لئے کہ جوانی کی یہ باتیں بڑھاپے ہی میں زیادہ لطف دیتی ہیں۔ جناب منور کا یہ دیوان صرف ۴۷ غزلوں پر مشتمل ہے، لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہیں بھی حشو و زواید آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔

اُردو شاعری میں غزل سے زیادہ نازک صنف سخن کوئی نہیں اور اس کارگہ شیشہ گری کا رکھ رکھاؤ بڑا دشوار ہے غالباً یہی سبب ہے کہ ہماری نئی نسل نے شاعری کی زیادہ آسان راہیں اختیار کرلیں اور شاعروں کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ لیکن قدر اول کے شعراء اب بھی غزل ہی کی زمین سے اُبھرتے ہیں اور انھیں میں ایک منور صاحب بھی ہیں۔

اس مجموعہ کے آغاز میں جناب راج نراین رازؔ نے منور صاحب کی غزل گوئی پر بڑا لطیف و صحیح تبصرہ کیا ہے اور ان کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ "منور کی غزل میں آپ کو لفظ و معنی کی ایک نئی دنیا آباد ملے گی"۔

خصوصیات غزل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے محاسن کی تعیین میں بھی بڑی بڑی فنی و وجدانی توجیہات سے کام لیا گیا ہے، لیکن میں نے اس کا ایک سادہ سا معیار یہ قایم کیا ہے کہ ہم اس کو سُن کر لطف اندوز تو ہوں لیکن اس لطف کے اظہار سے قاصر رہیں اور منور صاحب کی غزلوں میں ہم کو ایسے اشعار متعدد نظر آتے ہیں۔ مثلاً:-

نہیں محال تجھے زندگی میں پالینا — مگر ہے شرط تری جستجو میں کھو جانا

عمرِ رواں کو تھا مری روداد سے گریز — ظالم سُنا کے اپنی کہانی چلی گئی

کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب — آنسو بھرے ہیں دیدۂ اُمیدوار میں

کاش تم اس کا فیصلہ میرے ہی دل پہ چھوڑ دو — کس کی میں بندگی کروں، کون مرا خدا بنے

جانتا ہوں یہ کہ عرض شوق ہے توہین شوق — پھر بھی عرضِ شوق پر مجبور ہو جاتا ہوں میں

اب اس کا امتیاز بھی امر محال ہے — آتے ہیں وہ اِدھر کہ اُدھر جا رہا ہوں میں

غزل کے باب میں خود منور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:-

شاعری وحی سے الہام سے آگے نہ بڑھی — اک قدم بھی روشِ عام سے آگے نہ بڑھی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فکرِ شاعرانہ کا نقطۂ نظر کتنا بلند ہے — ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت عہ

اقبال کے آخری دو سال تصنیف ہے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اوڈوائر کے زمانہ سے لیکر مسجد شہید گنج کے قضیہ تک جب نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کس سیاسی بحران سے گزر رہا تھا، اس ہنگامۂ سیاست میں اقبال نے کتنا اور کیسا اہم رول انجام دیا۔

پلان سے کیسا ہو گا

عوام کے لئے تعلیم

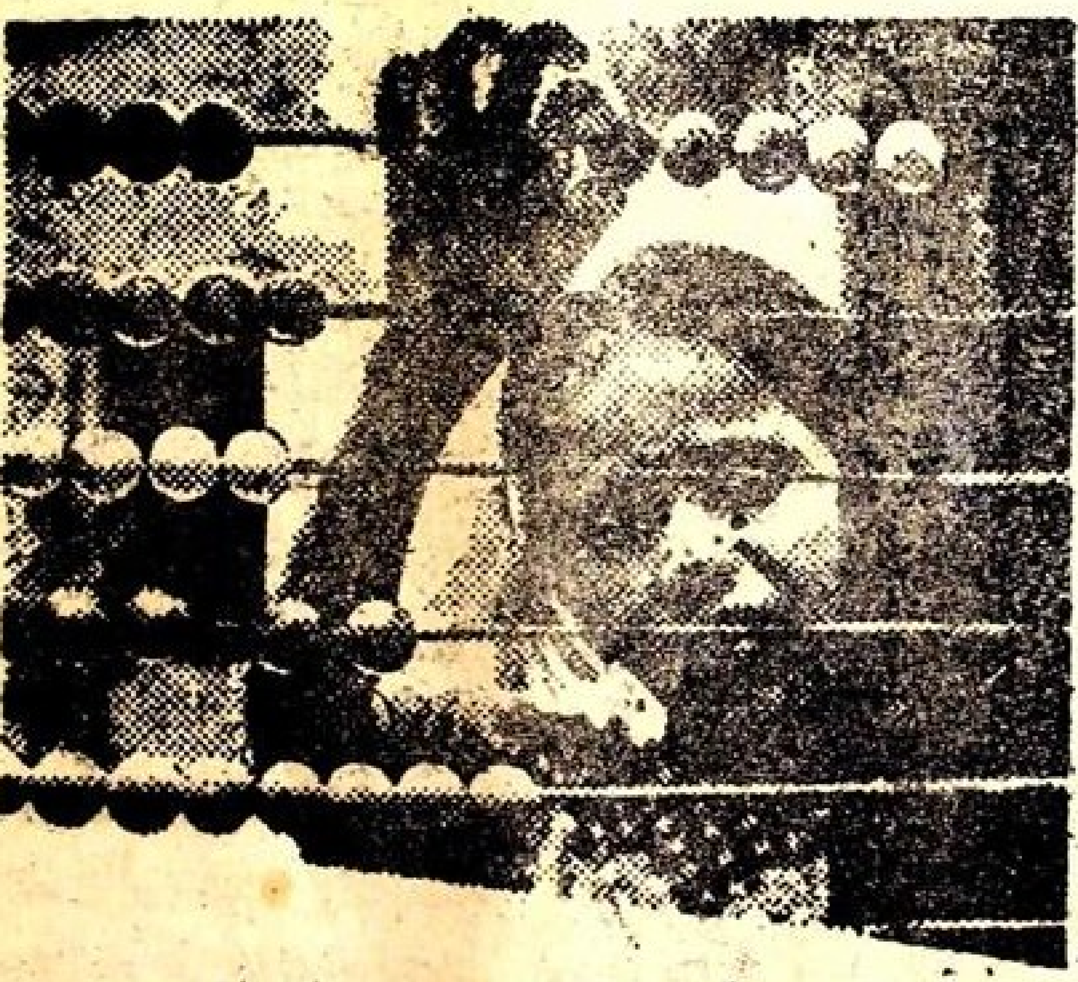

مفت پرائمری تعلیم
(چھ سے گیارہ برس تک کی عمر کے لگ بھگ پانچ کروڑ بچوں کے لئے)
اعلیٰ اور ٹکنیکل تعلیم کے زیادہ مواقع
استادوں کی تربیت کے لئے زیادہ سہولیات
زیادہ تعداد میں وظائف سے
آپ کے بچے تعلیم سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

پلان کو کامیاب بنائیے ۔ اس کا نتیجہ ہوگا

ہر شخص کے لئے اچھی زندگی

تیسرا پنج سالہ پلان

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب نہ صرف اقبالیات بلکہ پوری سیاست ہند کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور آزادی ہند کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب کو ترتیب میں جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ان میں سے اکثر عام دسترس سے باہر ہیں، اس لئے اس کی اہمیت تاریخی حیثیت سے بھی مسلم ہے۔ یہ کتاب علاوہ تین ضمیموں کے پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب ایک مستقل موضوع کے لئے مخصوص ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایسے سیاسی مقالات کا مجموعہ ہے جن سے ہم علٰحدہ علٰحدہ بھی فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یہ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ قیمت نو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکاڈمی۔ کراچی

اسرار و رموز پر ایک نظر

تصنیف ہے جناب پروفیسر محمد عثمان کی۔ جس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی تصانیف میں "اسرار و رموز" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے جو درس مسلم قوم کو دیا گیا ہے، وہ نیا نہ ہو لیکن بھلایا ہوا یقیناً ہے اور اس لئے ضروری تھا کہ اسے موثر طریقہ سے پھر پیش کیا جاتا۔ ڈاکٹر اقبال نے اسی فرض کو "اسرار و رموز" سے ادا کیا ہے اور اتنے گہرے تاثر کے ساتھ کہ ممکن نہیں اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اپنے اندر ایک خاص کیفیت یقین کی محسوس نہ کریں جو تعلیمات اقبال کی بنیاد اولیں ہے۔

فاضل مصنف نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا انفرادی نظریات کا، دوسرا ملی و اجتماعی نقطۂ نظر کا، اور انھیں دو تقسیموں کے تحت "اسرار و رموز" کی شرح و تفسیر کی گئی ہے۔

ہر چند جس حد تک زبان و بیان کا تعلق ہے اس کاوش کی ضرورت نہ تھی لیکن اس کی معنویت و افادیت کے پیش نظر یقیناً اسے بار بار سمجھانے اور دہرانے کی ضرورت تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ فاضل مصنف نے جس دلکش اسلوب اور پر خلوص مفکرانہ انداز سے یہ فرض ادا کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے اور ہمیں امید ہے کہ "اقبالیات" کے طلبہ اس سے بہت مستفید ہوں گے۔

کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شایع ہوئی ہے۔ ضخامت ۱۹۰ صفحات۔ قیمت للعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکاڈمی۔ کراچی۔

اقبال اور حیدر آباد

جناب نظر حیدر آبادی کی تالیف ہے جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حیدر آباد نے اقبال کو کیا سمجھا اور کتنی عزت و توقیر سے ان کی پزیرائی کی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے اقبال، حیدر آباد کب گئے، کیونکر گئے اور اہل حیدر آباد نے جس میں وہاں کے خواص و عوام، شعراء و ادیب سب شامل تھے ان کا کتنا پر خلوص خیر مقدم کیا۔ اس داستان لطیف کے سلسلہ میں اقبال کے سیاسی نظریات پر بھی جا بجا واضح گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب بھی اقبال اکاڈمی کراچی نے بڑے اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کی ہے۔

قیمت:۔ پانچ روپیہ۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔

Introduction to the thought of Iqbal.

ترجمہ ہے "مس لیوس کلاڈ میری" کی فرانسیسی تصنیف کا جسے ملا عبدالمجید ڈار بیرسٹر نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔

یہ کتاب مختصر سا سوانحی خاکہ ہے ڈاکٹر اقبال کا اور چند نظموں کا ترجمہ مع تشریحات کے ـــــ اس کتاب میں تصانیف اقبال پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے جو افادہ سے خالی نہیں۔

ضرورت تھی کہ نظموں کے ترجمہ کے ساتھ اصل نظمیں بھی درج کر دی جاتیں۔

یہ کتاب بھی اقبال اکاڈمی کراچی سے مل سکتی ہے۔

پورا پتہ
تیز ڈاک رسانی

آپ کے خط کا پورا پتہ ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور جب آپ اپنی تحریر کے اس حصے میں اختصار سے کام لیتے ہیں تو ہمیں سخت چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ پتہ نامکمل ہو تو خط پہونچانے کے لئے بڑی تلاش سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں خط پہونچانے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

پتہ مکمل اور صاف لکھئے۔
آپ کے خط یقیناً جلدی پہونچیں گے۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمۂ ڈاک و تار۔

۱/۲۱۵

دیرے ست کہ خاطرم بجانیست

میری صحت کچھ عرصہ سے خراب ہے اور ہو سکتا ہے کہ استردادِ صحت کی غرض سے مجھے کچھ زمانہ کے لئے لکھنؤ چھوڑ کر باہر جانا پڑے۔

اس صورت میں "نگار" کی اشاعت ملتوی تو نہ ہوگی لیکن "تاخیر و تعویق کا امکان ضرور ہے اور اگر آئندہ کسی مہینہ کا "نگار" بروقت نہ پہونچے تو آپ متردد نہ ہوں۔

دفتر کا کام بدستور جاری رہے گا اور میرے ذاتی خطوط و مضامین مجھ تک پہونچتے رہیں گے۔

اخیر میں پھر یہ عرض کروں گا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ کوئی امر یقینی نہیں ہے، بہت ممکن ہے کہ میں باہر نہ جا سکوں۔

نیاز

کیلو میں خریدیے...

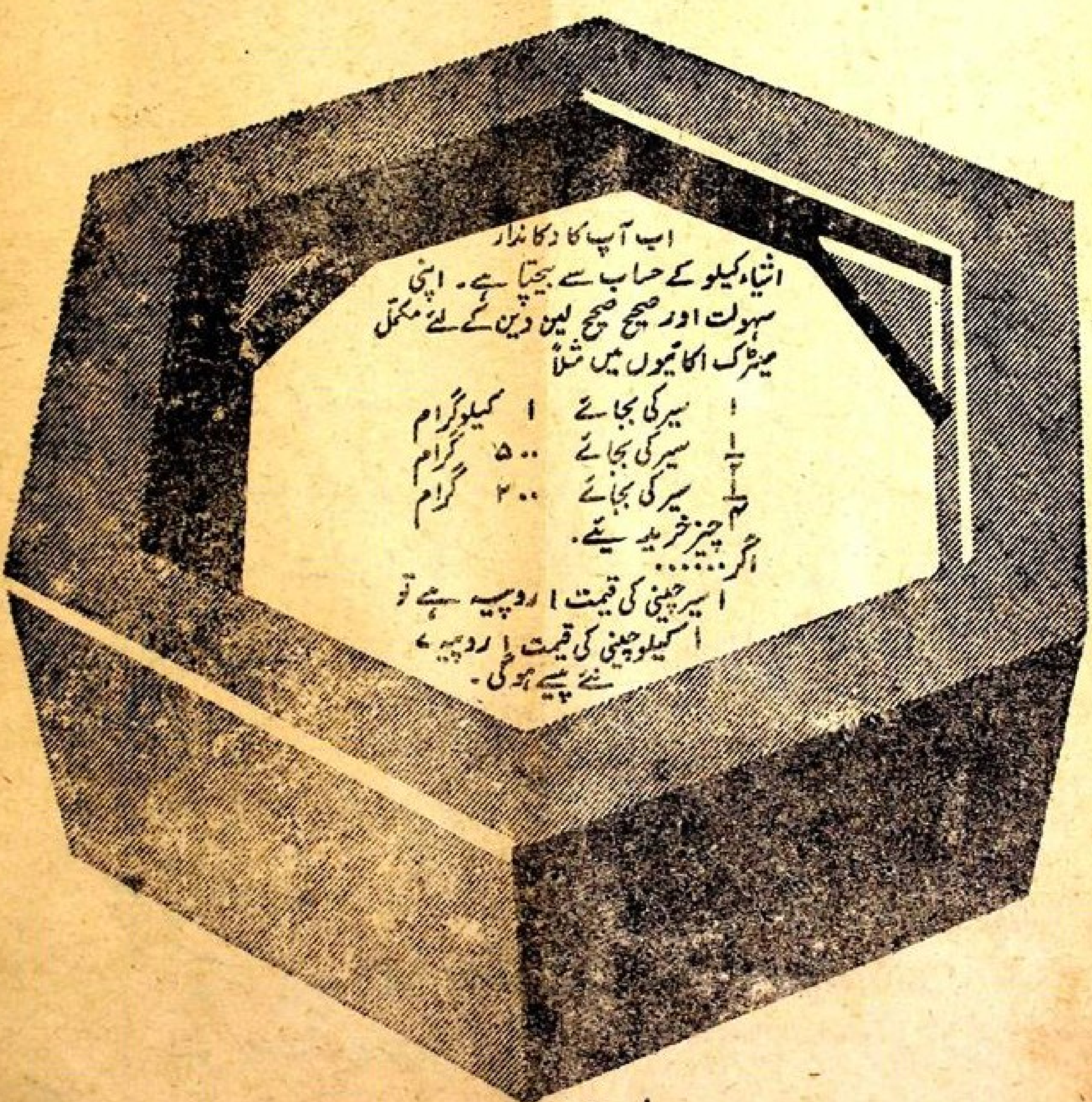

میٹرک باٹ

آسانی اور یکسانی کے لئے

جاری کردہ بھارت سرکار